ستمبر ۲۰۰۸ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فیصلہ کن گھڑی

وطن عزیز پاکستان کی موجودہ صورت حال پر ہر باشعور اور دردمند پاکستانی خون کے آنسو رونے پر مجبور ہے۔ آٹھ سالہ فوجی آمریت کی سیاہ رات جو جبر' بے اصولی اور ڈھٹائی سے عبارت تھی' کے خاتمے کے بعد جمہوری دور کا جو سپیدۂ سحر نمودار ہوا وہ اتنا مایوس کن اور اذیت ناک ہے کہ ''حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں'' کی سی کیفیت ہے۔ اور ملک وملت کے تمام بہی خواہ شدید پریشانی سے دوچار ہیں کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں! امریکی غلامی کا جو قلادہ نائن الیون کے مبینہ سانحے کے بعد ہمارے سابق کمانڈو حکمران نے تمغۂ امتیاز سمجھ کر اپنی گردن میں ڈالا تھا اس نے نہ صرف ملک وقوم کو ذلت و رسوائی کے اندھے کنوئیں میں جا گرایا بلکہ دوقومی نظریے اور ہماری دینی اقدار کو امریکہ کے چرنوں پر بے رحمانہ انداز میں قربان کرنے کے عمل نے ہم سے ہمارا قومی وملی تشخص بھی چھین لیا۔ چنانچہ اس آٹھ سالہ دور کی غلط پالیسیوں کے نتیجے میں کہ جو دراصل اسلام کے ساتھ واضح بے وفائی اور خالق کون ومکان کے خلاف بغاوت پر مشتمل تھیں' آج ہمارا جسد قومی پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ ''دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ'' کا حصہ بن کر' جو دراصل اسلام اور مسلمانوں کا وجود مٹانے کی عالمی سازش ہے' ہم دراصل اپنے ہی جسدِ ملّی پر خنجر زنی کے مرتکب ہوتے رہے ہیں ــــــ امریکہ کے دباؤ پر ہم نے آج تک جو شرمناک کردار ادا کیا ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں اور اپنے ہی شہریوں کو امریکہ کے اشارے پر عالمی درندوں کے حوالے کر کے ڈالر وصول کرنے پر فخر کا اظہار کیا جاتا رہا' یہ ہماری تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔

قوم کو توقع تھی کہ پرویز مشرف سے نجات پانے کے بعد' نئی قیادت ہمیں اس ذلت و رسوائی سے نجات دلائے گی اور امریکی غلامی کے قلادے کو اتار پھینکنے کے عمل کا آغاز ہو جائے گا' جس کے نتیجے میں پاکستان کی خودمختاری اور آزادی جو قبل ازیں نہایت سستے داموں امریکہ کے ہاتھ فروخت کر دی گئی تھی' اس کے دوبارہ حصول کے امکانات روشن ہو جائیں گے ــــــ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! یہ ہماری قومی بدنصیبی ہے کہ مروّجہ جمہوری عمل کے نتیجے میں وجود

میں آنے والی نئی حکومت' تا ایں دم' سابقہ حکومت سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ مشرف دور کی پالیسیاں جن کے باعث ملک وقوم کا بیڑہ غرق ہوا' ان کا تسلسل آج بھی جاری ہے بلکہ امریکہ کی خوشنودی کی خاطر اپنے ہی جسدِ ملی پر خنجر زنی کرنے کا عمل پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے ——— باجوڑ اور سوات میں ہماری حکومت اپنے ہی شہریوں کا بے دریغ قتل عام کر رہی ہے۔ ہماری سابقہ غلط پالیسیوں کے باعث وہاں شر پسند عناصر کو بھی کھل کھیلنے کا موقع ملا اور سی آئی اے' را اور موساد سمیت تمام عالمی خفیہ ایجنسیاں جو اسلام اور پاکستان کو مٹانے کا ایجنڈا رکھتی ہیں' انہیں قدم جمانے کا موقع ملا۔ چنانچہ آج بھارت ہماری مغربی سرحد کی جانب سے ہم پر بھرپور وار کر رہا ہے۔ یہ ہماری نااہلی کی انتہا ہے کہ شر پسندوں کی سرکوبی کرنے کی بجائے ہم اپنے عوام کا قتل عام کر کے امریکہ کو راضی کرنے ہی کو اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ ہمیں اندازہ نہیں ہے کہ ہم اجتماعی خودکشی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ فوج اور عوام کے درمیان نفرت کی خلیج حائل کرنا ہی ہمارے دشمنوں کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ مشرقی پاکستان جیسے حالات پیدا کرنے میں ہمارے دشمن بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ دنیا کی واحد اسلامی ایٹمی قوت کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے ——— ہم نے امریکہ کو اپنے ملک پر اس درجے مسلط کر لیا ہے کہ وہ اب اس سرزمین پر براہِ راست من مانی کارروائیاں کرنے لگا ہے۔ افسوس کہ ہم حالات سے سبق سیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ذاتی اور گروہی مفادات کی دلدل سے نکلنے کو کوئی تیار نہیں ——— شاید پاکستان کے لیے فیصلہ کن گھڑی آ پہنچی ہے۔ ہماری معاشی صورت حال بھی انتہائی خوفناک نقشہ پیش کر رہی ہے۔ مہنگائی کا سیلاب تھامے نہیں تھم رہا۔ زمینی حقائق نہایت سنگین ہیں' تاہم ایک ذات آج بھی ہمیں تباہی سے بچانے پر قادر ہے' شرط یہ ہے کہ ہم خلوص کے ساتھ اس کا دامن تھامیں' اجتماعی توبہ کا راستہ اختیار کریں' اللہ' اس کے رسول ﷺ اور اس کے دین کے سچے وفادار بن جائیں۔ بصورت دیگر نوشتۂ دیوار پڑھنا اب ہرگز مشکل نہیں رہا۔

❁ ❁ ❁

اطلاع برائے قارئین

قارئین کرام اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرما لیں کہ میثاق کے زیر نظر شمارے کی حیثیت خصوصی اشاعت کی ہے اور یہ دو ماہ (ستمبر' اکتوبر ۲۰۰۸ء) کے شماروں کے قائم مقام ہے۔ اسی مناسبت سے اس کی ضخامت میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا گیا ہے۔ قیمت فی شمارہ ۴۰ روپے ہے۔

دورۂ ترجمۂ قرآن **ڈاکٹر اسرار احمد**

سُورۃُ البقرۃ

آیات ۲۸۴ تا ۲۸۶

﴿ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ
اَوۡ تُخۡفُوۡهُ یُحَاسِبۡكُمۡ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَیَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ
وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ
وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ
اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ٭ غُفۡرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیۡكَ
الۡمَصِیۡرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَعَلَیۡهَا
مَا اكۡتَسَبَتۡ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَاۤ اِنۡ نَّسِیۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ
عَلَیۡنَاۤ اِصۡرًا كَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلۡنَا مَا
لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعۡفُ عَنَّا ٝ وَاغۡفِرۡ لَنَا ٝ وَارۡحَمۡنَا ٝ اَنۡتَ مَوۡلٰىنَا
فَانۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۲۸۶﴾ ﴾

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہم سورۃ البقرۃ کے آخری رکوع پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ عظیم الشان رکوع تین آیات پر مشتمل ہے۔ قبل ازیں ہم اسی طرح کا ایک عظیم رکوع پڑھ آئے ہیں جس کی چار آیات ہیں اور اس میں آیت الکرسی بھی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں رکوع اپنی عظمت اور اپنے مقام کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں۔ آیت الکرسی توحید کے موضوع پر قرآن حکیم کی جامع ترین آیت ہے' اور اس رکوع کی آخری آیت جامع ترین دعا پر مشتمل ہے۔

آیت ۲۸۴ ﴿ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ ﴾ ''اللہ ہی کا ہے جو کچھ بھی

آسمانوں میں ہے اور جو کچھ بھی زمین میں ہے۔''

آپ دیکھیں گے کہ اکثر و بیشتر اس طرح کے الفاظ سورتوں کے اختتام پر آتے ہیں۔

﴿وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡہُ یُحَاسِبۡکُمۡ بِہِ اللّٰہُ﴾ ''اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے خواہ تم اسے ظاہر کرو خواہ چھپاؤ اللہ تم سے اس کا محاسبہ کرلے گا۔''

تمہاری نیتیں اس کے علم میں ہیں۔ ایک حدیث میں الفاظ آتے ہیں: ((اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنۡظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمۡ وَاَمۡوَالِکُمۡ وَلٰکِنۡ یَنۡظُرُ اِلٰی قُلُوۡبِکُمۡ وَاَعۡمَالِکُمۡ))(۱) ''یقیناً اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو اور تمہارے مال و دولت کو نہیں دیکھتا' بلکہ تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے''۔ تو تمہارے دل میں جو کچھ ہے خواہ اسے کتنا ہی چھپا لو اللہ کے محاسبے سے نہیں بچ سکو گے۔

﴿فَیَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ﴾ ''پھر وہ بخش دے گا جس کو چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا۔''

اختیارِ مطلق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے ہاں اہل سنت کا عقیدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر لازم نہیں ہے کہ نیکوکار کو اس کی جزا ضرور دے اور بدکار کو اس کی سزا ضرور دے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ ایسا کرے گا' لیکن اللہ کی شان اس سے بہت اعلیٰ وارفع ہے کہ اس پر کسی شے کو لازم قرار دیا جائے۔ اس کا اختیار مطلق ہے' وہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ﴿۱۶﴾﴾ (البروج) کی شان کا حامل ہے۔ سورۃ الحج میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ ﴿۱۸﴾﴾ ''یقیناً اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے''۔ اہل تشیع کا موقف یہ ہے کہ اللہ پر عدل واجب ہے۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ اللہ عدل کرے گا' جزاء وسزا میں عدل ہوگا' لیکن عدل کرنا اس پر واجب نہیں ہے' بلکہ اللہ نے جو شے اپنے اوپر واجب کی ہے وہ ''رحمت'' ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿کَتَبَ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ﴾ (الانعام: ۱۲) اور: ﴿کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ﴾ (الانعام: ۵۴) ''تمہارے ربّ نے رحمت کو اپنے اوپر واجب کرلیا ہے''۔

﴿وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۸۴﴾﴾ ''اور اللہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔''

آیت ۲۸۵ ﴿اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مِنۡ رَّبِّہٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ﴾ ''ایمان لائے رسول (ﷺ) اس چیز پر جو نازل کی گئی انؐ کی جانب انؐ کے ربّ کی طرف سے اور

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ واحتقارہ ......الخ۔ وسنن ابن ماجہ' کتاب الزھد' باب القناعۃ۔ ومسند احمد: ۷۷۶۸ و ۱۰۵۷۷۔

مؤمنین بھی (ایمان لائے۔)''

یہ ایک غور طلب بات اور بڑا باریک نکتہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر جب وحی آئی تو آپ ؐ نے کیسے پہچان لیا کہ یہ بدروح نہیں ہے' یہ جبرائیل امین ؑ ہیں؟ آخر کوئی اشتباہ بھی تو ہوسکتا تھا۔ اس لیے کہ پہلا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے نہ تو آپ ﷺ نے کہانت سیکھی اور نہ آپ ؐ نے کوئی نفسیاتی ریاضتیں کیں۔ آپ ﷺ تو ایک کاروباری آدمی تھے اور اہل وعیال کے ساتھ بہت ہی بھرپور زندگی گزار رہے تھے۔ آپ ﷺ کا بلندترین سطح کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تھا۔ یہ درحقیقت آپ ﷺ کی فطرتِ سلیمہ تھی جس نے وحی لانے والے فرشتے کو پہچان لیا اور آپ ؐ اس وحی پر ایمان لے آئے۔ نبی کی فطرت اتنی پاک اور صاف ہوتی ہے کہ اس کے اوپر کسی بدروح وغیرہ کا کوئی اثر ہو ہی نہیں سکتا۔ بہرحال ہمارے لیے بڑی تسکین کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے ایمان کے تذکرے کے ساتھ ہمارے ایمان کا تذکرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اصحابِ ایمان میں شامل فرمائے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔

﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ﴾ ''یہ سب ایمان لائے اللہ پر' اس کے فرشتوں پر' اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔''

سورۃ البقرۃ میں یہ دوسرا مقام ہے جہاں ایمان کے اجزاء کو گنا گیا ہے۔ قبل ازیں آیۃ البر (آیت ۱۷۷) میں اجزائے ایمان کی تفصیل بیان ہوچکی ہے۔

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ ''(یہ کہتے ہیں کہ) ہم اللہ کے رسولوں میں کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔''

یہ بات تیسری مرتبہ آگئی ہے کہ اللہ کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔ سولہویں رکوع میں ہم یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۱۳۶﴾ ''ہم ان میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے فرماں بردار ہیں''۔ اور سب سے پہلے آیت ۴ میں یہ الفاظ آچکے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ ''وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اس پر بھی جو (اے نبی ﷺ) آپ ؐ پر نازل کیا گیا اور اُس پر بھی جو آپ ؐ سے پہلے نازل کیا گیا''۔ البتہ رسولوں کے درمیان تفضیل ثابت ہے اور ہم یہ آیت پڑھ چکے ہیں: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ﴾ (آیت ۲۵۳) ''یہ رسول جو ہیں ہم نے ان میں سے

بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ ان میں سے وہ بھی تھے جن سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کے درجے (کسی اور اعتبار سے) بلند کر دیے''۔

﴿وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔''

﴿غُفۡرَانَکَ رَبَّنَا﴾ ''پروردگار! ہم تیری بخشش مانگتے ہیں''

غُفۡرَانَکَ مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی نَسۡئَلُکَ غُفۡرَانَکَ اے اللہ! ہم تجھ سے تیری مغفرت طلب کرتے ہیں، ہم تیری بخشش کے طلب گار ہیں۔

﴿وَاِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۲۸۵﴾﴾ ''اور تیری ہی جانب لوٹ جانا ہے۔''

یہاں پر ایمان بالآخرۃ کا ذکر بھی آ گیا جو اوپر ان الفاظ میں نہیں آیا تھا: ﴿کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ﴾۔ اب آخری آیت آ رہی ہے۔

آیت ۲۸۶ ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا﴾ ''اللہ تعالیٰ نہیں ذمہ دار ٹھہرائے گا کسی جان کو مگر اس کی وسعت کے مطابق۔''

یہ آیت اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے فضل و کرم کا مظہر ہے۔ میں نے آیت ۱۸۶ کے بارے میں کہا تھا کہ یہ دنیا میں حقوقِ انسانی کا سب سے بڑا منشور (Magna Carta) ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے: ﴿اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ ''میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی (اور جہاں بھی) وہ مجھے پکارے''۔ ﴿فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَلۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ﴾ ''پس انہیں بھی چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں''۔ گویا دو طرفہ بات چلے گی، یک طرفہ نہیں۔ میری مانو، اپنی منواؤ! تم دعائیں کرو گے، ہم قبول کریں گے! لیکن اگر تم ہماری بات نہیں مانتے تو پھر تمہاری دعا تمہارے منہ پر دے ماری جائے گی، خواہ قنوتِ نازلہ چالیس دن تو کیا اسّی دن تک پڑھتے رہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمہاری دعاؤں کے باوجود تمہیں سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ دیکھنا پڑا، تمہیں یہودیوں کے ہاتھوں شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اگرچہ ان مواقع پر حرمین شریفین میں قنوتِ نازلہ پڑھی جاتی رہی، لیکن تمہاری دعائیں کیونکر قبول ہوتیں! تمہارا جرم یہ ہے کہ تم نے اللہ کو پیٹھ دکھائی ہوئی ہے، اس کے دین کو پاؤں تلے روندا ہوا ہے، اللہ کے باغیوں سے دوستی رکھی ہوئی ہے۔ کسی نے ماسکو کو اپنا قبلہ بنا رکھا تھا تو کسی نے واشنگٹن کو۔ لہٰذا تمہاری دعائیں تمہارے منہ پر دے ماری گئیں۔

لیکن آیت زیرِ مطالعہ اس اعتبار سے بہت بڑی رحمت کا مظہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں

3

اندھے کی لاٹھی والا معاملہ نہیں ہے کہ تمام انسانوں سے محاسبہ ایک ہی سطح پر ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ کس کی کتنی وسعت ہے اور اسی کے مطابق کسی کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اور یہ وسعت موروثی اور ماحولیاتی عوامل پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہر شخص کو جو genes ملتے ہیں وہ دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور ان genes کی اپنی خصوصیات (Properties) اور تحدیدات (limitations) ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر شخص کو دوسرے سے مختلف ماحول میسر آتا ہے۔ تو ان موروثی عوامل (heriditary factors) اور ماحولیاتی عوامل (environmental factors) کے حاصل ضرب سے انسان کی شخصیت کا ایک ہیولیٰ بنتا ہے، جس کو مستری لوگ ''پاٹن'' کہتے ہیں۔ جب لوہے کی کوئی شے ڈھالنی مقصود ہو تو اس کے لیے پہلے مٹی یا لکڑی کا ایک سانچہ (pattern) بنایا جاتا ہے۔ اس کو ہمارے ہاں کاریگر اپنی بولی میں ''پاٹن'' کہتے ہیں۔ اب آپ لوہے کو پگھلا کر اس میں ڈالیں گے تو وہ اسی صورت میں ڈھل جائے گا۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ ''شاکلہ'' ہے جو ہر انسان کا بن جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴾ (بنی اسراءیل) ''کہہ دیجیے کہ ہر کوئی اپنے شاکلہ کے مطابق عمل کر رہا ہے۔ پس آپ کا ربّ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سیدھی راہ پر ہے''۔ اس شاکلہ کے اندر اندر آپ کو محنت کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کس کا شاکلہ وسیع تھا اور کس کا تنگ تھا' کس کے genes اعلیٰ تھے اور کس کے ادنیٰ تھے' کس کے ہاں ذہانت زیادہ تھی اور کس کے ہاں جسمانی قوت زیادہ تھی۔ اسے خوب معلوم ہے کہ کس کو کیسی صلاحیتیں ودیعت کی گئیں اور کیسا ماحول عطا کیا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ماحولیاتی عوامل اور موروثی عوامل کو ملحوظ رکھ کر اُس کی استعدادات کے مطابق حساب لے گا۔ فرض کیجیے ایک شخص کے اندر استعداد ہی ۲۰ درجے کی ہے اور اس نے ۱۸ درجے کام کر دکھایا تو وہ کامیاب ہو گیا۔ لیکن اگر کسی میں استعداد سو درجے کی تھی اور اس نے ۵۰ درجے کام کیا تو وہ ناکام ہو گیا۔ حالانکہ کمیت کے اعتبار سے ۵۰ درجے ۱۸ درجے سے زیادہ ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کا محاسبہ جو ہے وہ انفرادی سطح پر ہے۔ اس لیے فرمایا گیا: ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴾ (مریم) ''اور سب لوگ قیامت کے دن اس کے حضور فرداً فرداً حاضر ہوں گے''۔ وہاں ہر ایک کا حساب اکیلے اکیلے ہوگا اور وہ اس کی وسعت کے مطابق ہوگا۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾ کے الفاظ میں جو ایک اہم اصول بیان کر دیا گیا ہے بعض لوگ دنیا کی زندگی میں اس کا غلط نتیجہ نکال بیٹھتے ہیں۔ وہ دنیا کے معاملات میں تو

خوب بھاگ دوڑ کرتے ہیں لیکن دین کے معاملے میں کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے اندر صلاحیت اور استعداد ہی نہیں ہے۔ یہ محض خودفریبی ہے۔ استعداد و استطاعت اور ذہانت و صلاحیت کے بغیر تو دنیا میں بھی آپ محنت نہیں کر سکتے‘ کوئی نتائج حاصل نہیں کر سکتے‘ کچھ کما نہیں سکتے۔ لہٰذا اپنے آپ کو یہ دھوکہ نہ دیجیے اور جو کچھ کر سکتے ہوں‘ وہ ضرور کیجیے۔ اپنی شخصیت کو کھود کھود کر اس میں سے جو کچھ نکال سکتے ہوں وہ نکالیے! ہاں آپ نکال سکیں گے اتنا ہی جتنا آپ کے اندر ودیعت ہے۔ زیادہ کہاں سے لے آئیں گے؟ اور اللہ نے کس میں کیا ودیعت کیا ہے‘ وہ وہی جانتا ہے۔ تمہارا محاسبہ اسی کی بنیاد پر ہوگا جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے۔ اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ کیجیے کہ یہ قرآن مجید میں پانچ مرتبہ آیا ہے۔

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط﴾ ”اسی جان کے لیے ہے جو اس نے کمایا اور اسی کے اوپر وبال بنے گا جو اس نے برائی کمائی۔“

اس مقام پر بھی ”ل“ اور ”عَلٰی“ کے استعمال پر غور کیجیے۔ ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ سے مراد ہے جو بھی نیکی اس نے کمائی ہوگی وہ اس کے لیے ہے‘ اس کے حق میں ہے‘ اس کا اجر و ثواب اسے ملے گا۔ ﴿وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط﴾ سے مراد ہے کہ جو بدی اس نے کمائی ہوگی اس کا وبال اسی پر آئے گا‘ اس کی سزا اسی کو ملے گی۔

اب وہ دعا آ گئی ہے جو قرآن مجید کی جامع ترین اور عظیم ترین دعا ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ ”اے ہمارے ربّ! ہم سے مؤاخذہ نہ فرمانا اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے۔“

ایمان اور عمل صالح کے راستے پر چلتے ہوئے اپنی شخصیت کے کونوں کھدروں میں سے امکان بھر اپنی باقی ماندہ توانائیوں (residual energies) کو بھی نکال نکال کر اللہ کی راہ میں لگالیں‘ لیکن اس کے بعد بھی اپنی محنت پر‘ اپنی نیکی‘ اپنی کمائی اور اپنے کارناموں پر کوئی غرہ نہ ہو‘ کوئی غرور نہ ہو‘ کہیں انسان دھوکہ نہ کھا جائے۔ بلکہ اس کی کیفیت تواضع‘ عجز اور انکساری کی رہنی چاہیے۔ اور اسے یہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اے پروردگار! ہماری بھول چوک پر ہم سے مؤاخذہ نہ فرمانا۔

انسان کے اندر خطا اور نسیان دونوں چیزیں گندھی ہوئی ہیں۔ (اَلْاِنْسَانُ مُرَكَّبٌ مِنَ الْخَطَإِ وَالنِّسْيَانِ) خطا یہ ہے کہ آپ نے اپنی امکانی حد تک تو نشانہ ٹھیک لگایا تھا‘ لیکن نشانہ خطا

ہو گیا۔اس پر آپ کی گرفت نہیں ہوگی' اس لیے کہ آپ کی نیت صحیح تھی۔ایک اجتہاد کرنے والا اجتہاد کر رہا ہے' اس نے امکانی حد تک کوشش کی ہے کہ صحیح رائے تک پہنچے' لیکن خطا ہو گئی۔اللہ معاف کرے گا۔مجتہد مخطی بھی ہو تو اس کو ثواب ملے گا اور مجتہد مصیب ہو' صحیح رائے پر پہنچ جائے تو اس کو دوہرا ثواب ملے گا۔اور نسیان یہ ہے کہ بھولے سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((اِنَّ اللّٰہَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَأَ وَالنِّسْیَانَ))[1] ''اللہ تعالیٰ نے میری اُمت سے خطا اور نسیان معاف فرما دیا ہے۔''

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَآ اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَہٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ ''اور اے ربّ ہمارے! ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا تھا جو ہم سے پہلے تھے۔''

ایک حمل (بوجھ) وہ ہوتا ہے جس کو لے کر انسان چلتا ہے۔اسی سے ''حمال'' بنا ہے جو ایک بوری کو یا بوجھ کو اٹھا کر چل رہا ہے۔جو بوجھ آپ کی طاقت میں ہے اور جسے لے کر آپ چل سکیں وہ ''حمل'' ہے' اور جس بوجھ کو آپ اٹھا نہ سکیں اور وہ آپ کو بٹھا دے اس کو ''اِصر'' کہتے ہیں۔یہ لفظ سورۃ الاعراف (آیت ۱۵۷) میں پھر آئے گا: ﴿وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ ط﴾ ان الفاظ میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ انہوں نے لوگوں کے وہ بوجھ جو اُن کی طاقت سے بڑھ کر تھے' ان کے کندھوں سے اتار دیے۔ہم سے پہلے لوگوں پر بڑے بھاری بوجھ ڈالے گئے تھے۔شریعت موسوی ہماری شریعت کی نسبت بہت بھاری تھی۔جیسے ان کے ہاں روزہ رات ہی سے شروع ہو جاتا تھا' لیکن ہمارے لیے یہ کتنا آسان کر دیا گیا کہ روزے سے رات کو نکال دیا گیا اور سحری کرنے کی تاکید فرمائی گئی: ((تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السُّحُوْرِ بَرَکَۃً))[2] ''سحری ضرور کیا کرو' اس لیے کہ سحریوں میں برکت رکھی گئی ہے''۔پھر رات میں تعلق زن وشو کی اجازت دی گئی۔ان کے روزے میں خاموشی بھی شامل تھی۔یعنی نہ کھانا' نہ پینا' نہ تعلق زن وشو اور نہ گفتگو۔ہمارے لیے کتنی آسانی کر دی گئی ہے! ان کے ہاں یوم سبت کا حکم اتنا سخت تھا کہ پورا دن کوئی کام نہیں کرو گے۔ہمارے ہاں جمعہ کی اذان سے لے کر نماز کے ادا ہو جانے تک ہر کاروبارِ دنیوی حرام ہے۔لیکن اس سے پہلے اور اس کے بعد آپ کاروبار کر سکتے ہیں۔

(۱) سنن ابن ماجہ' کتاب الطلاق' باب طلاق المکرہ والناسی۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب برکۃ السحور من غیر ایجاب۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل السحور وتاکید استحبابہ واستحباب تأخیرہ۔

﴿رَبَّنَا وَلاَ تُحَمِّلْنَا مَا لاَ طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ ''اور اے ربّ ہمارے! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالنا جس کی ہم میں طاقت نہ ہو۔''

﴿وَاعْفُ عَنَّا قفة﴾ ''اور ہم سے درگزر فرماتا رہ!''

ہماری لغزشوں کو معاف کرتا رہ!

﴿وَاغْفِرْ لَنَا قفة﴾ ''اور ہمیں بخشتا رہ!''

ہماری خطاؤں کی پردہ پوشی فرمادے!

مغفرت کے لفظ کو سمجھ لیجیے۔ اس میں ڈھانپ لینے کا مفہوم ہے۔ مِغْفَرْ 'خود' (ہیلمٹ) کو کہتے ہیں' جو جنگ میں سر پر پہنا جاتا ہے۔ یہ سر کو چھپالیتا ہے اور اسے گولی یا تلوار کے وار سے بچاتا ہے۔ تو مغفرت یہ ہے کہ گناہوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ڈھانپ دے' ان کی پردہ پوشی فرمادے۔

﴿وَارْحَمْنَا قفة﴾ ''اور ہم پر رحم فرما۔''

﴿اَنْتَ مَوْلٰنَا﴾ ''تو ہمارا مولا ہے۔''

تو ہمارا پشت پناہ ہے' ہمارا والی ہے' ہمارا حامی و مددگار ہے۔ ہم یہ آیت پڑھ آئے ہیں: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط﴾ (آیت ۲۵۷)۔

﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾﴾ ''پس ہماری مدد فرما کافروں کے مقابلے میں۔''

انہی الفاظ پر وہ دعا ختم ہوئی تھی جو طالوت کے ساتھیوں نے کی تھی۔ اب اہل ایمان کو یہ دعا تلقین کی جارہی ہے' اس لیے کہ مرحلہ سخت آرہا ہے۔ گویا: ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالب
مرحلہ سخت ہے اور جان عزیز!

اب کفار کے ساتھ مقابلے کا مرحلہ آرہا ہے اور اس کے لیے مسلمانوں کو تیار کیا جارہا ہے۔ یہ درحقیقت غزوۂ بدر کی تمہید ہے۔

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم ونفعنى واياكم بالآيات والذكر الحكيم○○

*

تذکرہ و تبصرہ

”طالبانائزیشن“ یا اسلامائزیشن؟

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا قرآن آڈیٹوریم میں ۱۰/اگست ۲۰۰۸ء کا خطاب

خطبۂ مسنونہ اور ادعیہ ماثورہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٢١﴾﴾ (السجدة)

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ﴾ (الانعام:٦٥)

آج کے خطاب کا پس منظر اور فوری محرک

معزز حاضرین اور محترم خواتین! سب سے پہلے تو میں یہ بیان کر دوں کہ آج کے موضوع پر تقریر کا فوری سبب کیا بنا ہے۔ گویا اس کا پس منظر کیا ہے‘ یا جیسے ہم علمِ تفسیر میں کہتے ہیں کہ فلاں آیات کا شانِ نزول کیا ہے! درحقیقت حال ہی میں کراچی کی طرف سے ایک زبردست دہائی ہوئی ہے کہ وہاں طالبان آ رہے ہیں۔ وہاں کی ایک بڑی تعداد اردو بولنے والے مہاجرین کی اولاد پر مشتمل ہے۔ ان کے ایک اعتبار سے مسلّمہ لیڈر‘ بلکہ بہت سے لوگوں کے نزدیک ان کے پیر و مرشد الطاف حسین صاحب ہیں جو خود تو لندن میں براجمان ہیں‘ لیکن اُن کا حکم کراچی‘ حیدر آباد اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں چلتا ہے۔ ان کی طرف سے بڑی بلند آواز کے ساتھ دہائی آئی ہے کہ کراچی میں طالبان آ رہے ہیں۔ گویا وہاں پر کوئی حملہ ہونے والا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں لٹھ بردار

شریعت نہیں چلے گی' شریعت کو زبردستی نافذ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ انہوں نے کھلم کھلا اپنے پیروکاروں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں لائسنس بنوانے اور اسلحہ خریدنے کی ترغیب دی ہے۔ گویا کراچی میں بدامنی بلکہ خانہ جنگی کا شدید خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ سندھ حکومت کے دو اہم ذمہ داران نے نوٹس لیا ہے۔ میں نے سندھ کے وزیر داخلہ ذوالفقار علی مرزا کا بیان سنا ہے کہ یہاں ایسا خطرہ محسوس تو کیا جا رہا ہے لیکن یہ خطرہ حقیقی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ حکومت کا کام تو یہی ہے کہ خوف کو ختم کیا جائے۔ اسی طرح سندھ کے وزیر اعلیٰ قائم علی شاہ صاحب نے بھی یہی بات کہی ہے۔

اِس وقت اگر کچھ پختون پاکستان کے شمالی علاقوں سے آ کر کراچی کی طرف آباد ہو رہے ہیں تو یہ اس بات کا فوری نتیجہ ہے کہ ان کے علاقے میں بدامنی اور دہشت گردی ہے۔ وہاں پر کچھ غنڈہ گردی بھی ہو رہی ہے۔ مختلف قوتیں جن کے بارے میں مَیں بعد میں تجزیہ کر کے بیان کروں گا' وہاں برسرپیکار ہیں۔ پاکستان آرمی کا ایکشن بھی ہو رہا ہے۔ پھر یہ کہ امریکہ کے جہاز آ کر بمباری کرتے ہیں' میزائل برساتے ہیں۔ لہٰذا وہاں زندگی مخدوش ہوگئی ہے۔ ان علاقوں کے رہنے والے ایسے حالات میں وہاں کیسے رہیں! چنانچہ وہ نقل مکانی پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ان کا سب سے آسان انتخاب کراچی ہے' اس لیے کہ وہاں ایک بہت بڑی تعداد میں' جو کہ پندرہ بیس لاکھ سے کم نہیں ہے' پختون آباد ہیں۔ ان کی اپنی بستیاں ہیں' علیحدہ گڑھیاں ہیں۔ وہ سب کے سب محنت کش ہیں۔ ان کا کام زیادہ تر ٹرانسپورٹ کا ہے۔ یہ بسیں' منی بسیں' رکشا' ٹیکسی چلانے والے لوگ ہیں۔ ان کا تعلق وزیرستان کے مختلف علاقوں سے ہے۔ جن علاقوں کے لوگ اس وقت پریشان ہو کر نقل مکانی کر رہے ہیں' چونکہ ان کے رشتہ دار کراچی میں موجود ہیں اس لیے وہاں ان کو آسانی کے ساتھ پناہ مل سکتی ہے' کہیں ٹکنے کی جگہ مل سکتی ہے۔ چنانچہ وہ آ رہے ہیں۔ سندھ حکومت کے ان دونوں حضرات نے یہ بھی کہا کہ اگر یہ لوگ آ رہے ہیں تو پاکستان میں ہی آ رہے ہیں' پاکستان کے ایک علاقے سے پاکستان ہی کے دوسرے علاقے میں آ رہے ہیں' کوئی باہر سے نہیں آ رہے اور نہ کسی غیر ملک میں جا رہے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر ان کے یہ الفاظ بہت اچھے لگے ہیں کہ کراچی کی سرزمین پر ہر

*

پاکستانی کا حق ہے۔ کراچی تو گویا پورے پاکستان کی 'دولت مشترکہ' ہے۔ یہ دونوں باتیں اچھی ہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک بہت اہم بات انہوں نے کہی ہے اور آگے چل کر وہ میری گفتگو کا مرکزی مضمون بنے گا' اور وہ یہ ہے کہ ''طالبانائزیشن اور ہے' اسلامائزیشن اور ہے''۔ یہ بات اپنی جگہ پر بڑی اہم ہے اور اس کے نتائج کو سمجھنا اور قبول کرنا بہت ضروری ہے۔

طالبان کون؟ وجود میں کیسے آئے؟

اس پس منظر کو بیان کر کے سب سے پہلے میں آپ کے سامنے یہ معاملہ لانا چاہتا ہوں کہ یہ طالبان کون ہیں؟ کہاں سے آ گئے ہیں؟ تیس سال پہلے تک تو اِن کا کوئی تذکرہ نہیں تھا' سوائے اس کے کہ افغانستان میں دینی مدارس کے طالب علموں کو طالبان کہہ دیا جاتا تھا۔ طالبان ایک سیاسی یا عسکری قوت کی حیثیت سے کیسے منظر پر آئے' اس کے لیے سرسری طور پر افغانستان کی تاریخ کے پچھلے ۳۰'۳۵ سال کا جائزہ لینا ہوگا۔ افغانستان میں کئی سو سال سے ایک بادشاہی نظام اکثر و بیشتر بڑے اطمینان اور امن کے ساتھ چل رہا تھا۔ افغانستان کے دیہی علاقوں میں رہنے والوں کی عظیم اکثریت بڑے شدید مذہبی مزاج کی تھی۔ نماز روزہ اور پردہ وحجاب ان کے کلچر میں شامل تھا۔ ان کے ہاں ان چیزوں کے مذہب ہونے کا پہلو بعد میں آتا ہے' یہ ان کے کلچر کا جزو تھا۔ اس کے برعکس بڑے شہر خاص طور پر کابل' بادشاہی نظام کے تحت پوری طرح مغربیت کے رنگ میں رنگے جا چکے تھے۔ ایک دفعہ جب ظاہر شاہ پاکستان آئے تھے اور ان کے ساتھ ان کی بیگم ملکۂ افغانستان بھی تھیں تو وہ سکرٹ پہنے ہوئے تھیں' ان کی پنڈلیاں ننگی تھیں۔ اس پر لوگ بڑے حیران ہوئے تھے۔ چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ کابل پورے طور پر مغربی طرزِ معاشرت میں ڈھل چکا تھا۔ اس کیفیت میں اس وقت تبدیلی آئی جب سردار داؤد خان نے ظاہر شاہ کا تختہ الٹا۔ اگرچہ ان کا جھکاؤ اور رجحان روس کی طرف زیادہ تھا' تاہم وہ کوئی خالص نظریاتی کمیونسٹ نہیں تھے۔ اس کے بعد افغانستان میں یکے بعد دیگرے کئی حکمران قتل ہوئے۔ سردار داؤد کو کسی نے قتل کیا' اس کو کسی اور نے قتل کیا' پھر کسی اور نے اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوگئیں۔ اس کے خلاف اسلامی قوتوں

کی طرف سے مزاحمت ہوئی' کیونکہ اب کمیونزم کم سے کم افغانستان کے شہری علاقوں میں مضبوط قدم جما چکا تھا۔ پارٹیاں اگرچہ دو تھیں' یعنی پرچم اور خلق' لیکن ان دونوں کے درمیان فرق وہی تھا جو روسی انقلاب میں مانشویک اور بالشویک کا تھا' یعنی پارٹیاں دو لیکن نظریہ ایک' بالفاظِ دیگر کمیونزم ایک' قیادتیں دو۔ اسی طرح افغانستان میں دو پارٹیاں تھیں۔ اقتدار کے لیے ان کی آپس میں جنگ بھی جاری تھی' لیکن کمیونزم پر وہ بالکل پوری طرح متفق تھے۔

اب یہاں پاکستان میں اس کا جو ردّ عمل ہوا' اس کو سمجھئے۔ ابھی جبکہ وہ تحریک شروع ہوئی ہی تھی اور روسی فوجیں ابھی نہیں آئی تھیں' گویا یہ افغانستان کے اندر ایک لوکل phenomenon تھا' سب کچھ melting pot کے اندر تھا' تو اُس وقت بھی مسلمانوں کے اندر مذہبی مزاج کے لوگوں میں کمیونزم کے خلاف ایک ردّ عمل شروع ہوا۔ ان میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کا حصہ بہت زیادہ تھا۔ یہ لوگ یا تو پاک و ہند کی جماعت اسلامی کے یا پھر عالم عرب کے الاخوان المسلمون کے زیر اثر تھے۔ انہی کے لیڈروں میں گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود بھی تھے۔ ان دونوں کی بڑی گہری دوستی تھی اور یہ گویا کامریڈز تھے۔ پھر استاد ربانی اور عبدالرسول سیاف بھی تھے۔ اس قسم کے لوگوں نے مزاحمتی تحریک شروع کی تو یہاں بھٹو صاحب نے اس وقت صحیح قدم اٹھایا اور ان میں سے بعض لوگوں کو دعوت دی۔ وہ آئے اور دارالحکومت میں بھٹو صاحب کے مہمان رہے۔ بھٹو صاحب نے ان کی پیٹھ تھپکی کہ ٹھیک ہے کوشش کرو۔ اندازہ ہے کہ کچھ نہ کچھ انہیں مدد بھی دی ہوگی' کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ اگر افغانستان میں کمیونزم آ گیا اور روس قابض ہو گیا تو پھر اس کا اگلا ہدف پاکستان ہوگا' زارازم کو توسیع دینے کے لیے روس کا یہ صدیوں پرانا خواب ہے۔ سائبیرین ریچھ چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے افغانستان اور پاکستان کو روندتا ہوا بحیرۂ عرب اور بحر ہند کے گرم پانیوں تک پہنچ جائے۔ لہٰذا اگر افغانستان میں اس کے قدم جم جاتے تو اس کا اگلا ہدف پاکستان ہوتا! یہ صورت حال تھی جس میں بھٹو صاحب نے ایک بالکل صحیح قدم اٹھایا تھا۔

بعد میں جب روسی فوجیں آ گئیں تو ایک زبردست مزاحمت شروع ہوئی۔

*

درحقیقت اس مزاحمتی تحریک کا عنوان ''جہاد فی سبیل الحریت'' ہونا چاہیے تھا۔اس کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ آزادی تھی' اس لیے کہ افغان قوم غلام رہنے کی عادی نہیں ہے۔ وہ ذہنی اور جذباتی طور پر اس کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتی۔ پوری افغان تاریخ اس کی گواہ ہے۔ جب روس کے خلاف جنگ جاری تھی اور افغانستان میں جہاد ہو رہا تھا تو ایک دفعہ انگلستان کی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر پاکستان کے دورے پر آئی تھیں۔ انہوں نے طورخم کے مقام پر لوگوں سے ایک خطاب کیا تھا' جس میں یہ بڑا تاریخی جملہ کہا تھا کہ:

"We learnt our lesson and the Russians will also soon learn their lesson."

یعنی افغانستان کے بارے میں ہم نے تو سبق سیکھ لیا تھا۔ ہم نے بار بار فوج کشی کی اور اسے فتح کیا' لیکن یہاں پر اپنا قبضہ برقرار نہیں رکھ سکے۔ اسی طرح بالفرض روس نے یہاں قبضہ کر بھی لیا تو وہ یہاں رہ نہیں سکے گا۔ یہ سبق ہم نے تو سیکھ لیا ہے' روسی بھی سیکھ لیں گے!

بہرحال اس موقع پر جو صورت حال پیدا ہوئی' اس میں ایک نیا عنصر بھی شامل تھا جسے ذہن میں رکھنا چاہیے۔ یہ وہ دَور تھا جب پورے عالمِ اسلام میں احیائے اسلام اور نفاذِ شریعت کا ایک جذبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ یہ جذبہ اُس وقت شروع ہوا جب یورپی ممالک کی نوآبادیاتی حکمرانی کا بستر طے ہونا شروع ہوا۔ جیسے کوئی آدمی نیند سے اٹھے تو اسے یاد آتا ہے کہ میں نے کوئی خواب دیکھا تھا' اسی طرح جیسے جیسے مسلمان ممالک آزاد ہونا شروع ہوئے تو ان کو یاد آیا کہ ہمارا بھی ایک نظام ہوتا تھا۔ انگریزوں' ولندیزیوں' فرانسیسیوں' اطالویوں یا ہسپانویوں کے آنے سے پہلے ہمارا ایک نظام تھا تو کیوں نہ اب ہم اس نظام کو دوبارہ قائم کریں! یہ ایک جذبہ تھا' اگرچہ مبہم سا! آج کے دور میں اسلامی نظام کیسا ہوگا' اس کے کوئی واضح تصورات نہیں تھے' لیکن جذبہ بہرحال موجود تھا۔ اسی کو علامہ اقبال نے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے کہ مجھے دنیا میں جمہوریت سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ: ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر!

یہ تو ہم نے خود ہی بادشاہت کو ایک اور لبادہ اوڑھا کر اسے جمہوریت کا رنگ دے دیا ہے

اور اسے ''شخصی حاکمیت'' کے بجائے ''عوامی حاکمیت'' اور ''اجتماعی حاکمیت'' کی صورت دے دی ہے۔ غیر اللہ کی حاکمیت کا شرک اور کفر تو جوں کا توں موجود ہے۔ اسی طرح مجھے اشتراکیت سے بھی کوئی اندیشہ نہیں ہے:

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار' آشفتہ مغز' آشفتہ ہُو

ابلیس اپنے شیطانی نظام کے لیے کسی کو اگر خطرہ سمجھ رہا ہے تو وہ اُمت مسلمہ ہے۔

ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اِس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

یہ جذبہ اور تڑپ اگرچہ پورے عالم اسلام میں تھی' لیکن کہیں بھی اس کی کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُس وقت اس جذبے نے جہادِ افغانستان کی پشت پناہی کی کہ شاید افغانستان کے اندر اب یہ کام عملاً ہو جائے۔ اس کے لیے پوری دنیا سے مجاہدین آئے اور انہوں نے جانیں دیں۔ انڈونیشیا' برما' فلسطین' فلپائن' تھائی لینڈ' سعودی عرب' مصر' لیبیا' چیچنیا وغیرہ سے بہت سارے لوگ وہاں آئے' کیونکہ اب کہا گیا کہ یہ ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے۔ تاہم میں واضح کر چکا ہوں کہ میرے نزدیک وہ ''جہاد فی سبیل اللہ'' نہیں تھا۔ جہاد فی سبیل اللہ کی شرائط یہ ہیں کہ پہلے دعوت دی جائے' پھر جو لوگ دعوت کو قبول کر لیں انہیں منظّم کر کے ایک جماعت کی شکل دی جائے جو ایک امیر کی بیعت کر کے اس کے تابع ہوں۔ پھر اس جماعت کا تزکیہ اور تربیت اس طور سے ہو کہ دل میں سوائے اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح کے کوئی اور جذبہ باقی نہ رہے۔ ان کے لیے دنیا کے مال و دولت اور حکومت و سیادت میں کوئی کشش باقی نہ رہے۔ رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ اتنا ابھر آئے کہ تن من دھن حتیٰ کہ جان دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ ساری شرائط جہاد فی سبیل اللہ کی ہیں۔ افغانستان پر چونکہ ایک دم حملہ ہو گیا تھا اور روسی افواج داخل ہو گئی تھیں تو نہ ان شرائط کو پورا کرنے کا موقع تھا نہ وقت۔ وہ لوگ تو بس روس کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ لہٰذا یہ جہاد فی سبیل الحرّیت تھا' اور مسلمان جب آزادی کا جہاد کرتا ہے تو وہ بھی جائز جہاد ہے' اس میں جان دینا بھی شہادت ہے۔

*

بہر حال ایک تو یہ کہ جذبۂ جہاد اُن کو کھینچ کر لایا۔ دوسری طرف امریکہ یہ چاہتا تھا کہ روس سے ایک پرانا حساب برابر کر لیا جائے۔ امریکہ نے ویت نام میں روسیوں کے ہاتھوں جو شکست کھائی تھی اس کا بدلہ لینے کے لیے یہ سنہری وقت تھا۔ چنانچہ امریکہ نے اس جہاد کا غلغلہ مسلمانوں سے بڑھ کر بلند کیا اور پوری دنیا میں جہادی لیڈروں کے کردار اور شخصیت کو ابھارا۔ احمد شاہ مسعود کو ''دی لائن آف پنج شیر'' کہا گیا۔ پوری دنیا میں اس کی دھاک بٹھائی گئی تاکہ زیادہ سے زیادہ مجاہدین مل جائیں۔ امریکہ نے سوچا کہ ہمارا تو کوئی آدمی نہیں مرے گا، ہم نے صرف پیسے اور ہتھیار دینے ہیں۔ مریں گے تو یہ مسلمان، چاہے وہ افغان ہوں یا باہر سے آنے والے۔ امریکہ کے اس ایجنڈے کو نہ سمجھتے ہوئے افغان لیڈروں نے لاعلمی میں اسے تقویت پہنچائی۔ وہ جہاد کے لیے لوگوں کو عرب ممالک سے کھینچ کھینچ کر لے آئے۔ ان میں عبداللہ بن عزام شہید بھی تھے۔ انہی میں عمر عبدالرحمٰن ہیں، جو اِس وقت امریکہ کی جیل میں قید ہیں۔ انہی میں اسامہ بن لادن بھی ہیں۔ یہ سب لوگ جہاد کے نام پر دنیا بھر سے لوگوں کو لے کر آ رہے تھے اور یوں نہ جانتے ہوئے وہ امریکہ کے آلۂ کار بن گئے تھے۔ مجاہدین کی فتح میں دونوں عوامل کارفرما تھے۔ صرف مجاہدین کی سرفروشی اور جانفشانی ہی نہیں، امریکہ کے ہتھیاروں نے بھی یقیناً اس میں ایک بڑا فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ خصوصاً جدید ترین ہتھیار سٹنگر میزائل جسے دنیا جانتی ہی نہیں تھی، وہ مجاہدین کو دے دیا گیا۔ روسی فوج جو دلبرداشتہ ہو کر بھاگی ہے تو اس میں سب سے بڑا دخل سٹنگر میزائل کو حاصل تھا۔ روسیوں کا سب سے بڑا ہتھیار گن شپ ہیلی کاپٹر تھے۔ پہاڑوں کے اوپر ٹینک تو نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بڑے جہازوں کے لیے بہت نیچے آ کر بمباری کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس لیے وہ گن شپ ہیلی کاپٹر سے فائرنگ کرتے تھے۔ یہی ان کا سب سے بڑا ہتھیار تھا جسے سٹنگر میزائل نے بالکل بیکار کر کے رکھ دیا۔ یہ میزائل داغے جانے کے بعد اگر ہدف اپنی جگہ تبدیل کر لے تو یہ میزائل ضائع نہیں ہوتا، بلکہ جدھر وہ ہدف جائے گا یہ اس کا پیچھا کرے گا، جدھر وہ مڑے گا اُدھر ہی یہ مڑ جائے گا اور بالآخر اس کو تباہ کر دے گا۔

روس کی شکست کے بعد امریکہ بھی فوری طور پر وہاں سے غائب ہو گیا۔ اس نے

مجاہدین کے اندر گروپ بندی یہاں تک کہ باہمی دشمنی کے بھی بیج بو دیے تھے۔ اس میں آئی ایس آئی نے بھی کردار ادا کیا۔ آئی ایس آئی یہ چاہتی تھی کہ افغانستان میں کوئی ایک ایسی مضبوط حکومت نہ بن جائے جو ہمارے کنٹرول میں نہ رہے۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ نیک نیتی سے پاکستان کے لیے کیا۔ اب امریکہ بجائے اس کے کہ وہاں کوئی حکومت قائم کرواتا اور اسے مستحکم کرنے کے بعد آرام سے رخصت ہوتا' جیسا کہ وہ عراق کے اندر اپنا سرتوڑ زور لگا رہا ہے کہ کوئی حکومت قائم ہو جائے اور پھر ہم یہاں سے رفتہ رفتہ نکلیں' وہ ان کے مابین دشمنی کے بیج بو کر فوراً بھاگ گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ کو اندیشہ تھا کہ یہ لوگ پڑھے لکھے اور جدید تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں انجینئرز بھی ہیں۔ گلبدین حکمت یار' احمد شاہ مسعود' استاد ربانی بڑے عالم فاضل ہیں۔ عبدالرسول سیاف الازہر کے پڑھے ہوئے تھے۔ اسی طرح صبغت اللہ مجددی بھی بڑے عالم اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اس اعتبار سے امریکہ کو اندیشہ تھا کہ اگر ان لوگوں کی حکومت بن گئی تو یہ افغانستان کو ایک جدید اسلامی فلاحی ریاست بنا دیں گے۔ یہ وہ شے ہے جو اُن کے لیے سب سے زیادہ خطرناک اور سب سے زیادہ ناپسندیدہ تھی' اس لیے کہ اگر واقعتاً ایک اسلامی فلاحی ریاست وجود میں آ جاتی تو ان کے نظام کا خاتمہ ہو جاتا۔ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو تاریکی کو جانا ہی ہوتا ہے۔ انہیں یہ اندازہ تھا' اس لیے انہوں نے خاص طور پر انہیں لڑایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاد فی سبیل اللہ' فساد فی سبیل اللہ بن گیا اور افغانستان پر وہ تباہی آئی جو پہلے روسیوں کے ہاتھوں بھی نہیں آئی تھی۔ اصل تباہی و بربادی خانہ جنگی سے آئی ہے۔ اس کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف علاقوں میں جنگجو سرداروں (War Lords) نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں۔ وہی ہتھیار جو دورانِ جنگ امریکہ نے دیے تھے' کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اسلحہ خانہ تھا' لہٰذا انہوں نے اپنے اپنے علاقے معین کر لیے اور انہوں نے وہاں ٹیکس لینے شروع کیے کہ جو بھی گاڑی' بس' ٹیکسی وغیرہ گزرے ٹیکس دے۔ لوگ ایک علاقے سے نکلتے تو اگلے جنگجو سردار کا علاقہ آ جاتا اور وہاں پھر ٹیکس دیتے۔ نہ صرف ٹیکس بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ خوبصورت عورتوں اور لڑکوں کو بھی اُتار لیتے تھے۔ اس صورتِ حال سے افغان لوگوں کی ناک میں دم آ گیا۔

*

ان حالات میں ایک مردِ مجاہد ملا عمر کھڑے ہوئے۔ وہ کوئی بڑے عالم دین نہیں ہیں' بلکہ عربی مدارس سے پوری طرح تعلیم یافتہ بھی نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ عربی مدارس کے کچھ طلبہ کھڑے ہو گئے۔ ان لوگوں نے کمر کس لی کہ یہاں کسی طرح امن قائم کیا جائے۔ یہ پکار ایسی تھی جو ہر افغان کے دل کی پکار تھی۔ لوگ جنگجو سرداروں اور اُن کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ لہٰذا طالبان جہاں گئے' ان کا استقبال ہوا۔ اکثر لوگوں نے اپنے ہتھیار ان کے حوالے کر دیے۔ گلبدین حکمت یار کابل کے پاس اپنی فوجیں لے کر فیصلہ کن حملے کی تیاری میں تھے' لیکن جب طالبان آئے تو ان کو راستہ دے دیا اور خود پیچھے ہٹ گئے۔ یوں سمجھئے کہ درحقیقت افغانستان میں طالبان کی حکومت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خصوصی انعام تھا۔ وہ جو ایک شعر ہے کہ:

خود بخود تیار ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھئے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ طالبان کو کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور ان کی حکومت قائم ہو گئی۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی حکمت کا ایک ظہور ہوا ہے۔ خود امریکہ نے اور اس کے کہنے پر پاکستان' سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے طالبان کی حمایت کی۔ کہاں بے نظیر جیسی سیکولر ذہن کی حامل اور آزاد خیال عورت' کہاں طالبان مولوی ملاٹے! اس کی وجہ کیا ہے؟ دراصل امریکہ سمجھ رہا تھا کہ یہ ہمارے مطلب کے لوگ ہیں' انہیں دنیا کا کوئی علم نہیں ہے' یہ کچھ جانتے ہی نہیں' لہٰذا انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا اور اِن سے کھیلنا آسان ہو گا۔ انہیں ہم اپنی انگلیوں پر نچائیں گے' کٹھ پتلی بنا لیں گے۔ اس پہلو سے انہوں نے سمجھا کہ اچھا ہے اگر یہ لوگ آ جائیں' ان سے وہ خطرہ نہیں ہے کہ یہاں ایسا اسلامی نظام آ جائے جو بیک وقت جدید دنیا کے تمام تصورات کو بھی پورا کرتا ہو اور کتاب و سنت کے تقاضوں کو بھی۔ لہٰذا امریکہ نے انہیں مدد دی۔ لیکن ہوا کیا؟

کفر کے ایوانوں میں خطرے کی گھنٹیاں

طالبان کے اقتدار میں آنے کے بعد دو کام ایسے ہوئے کہ امریکہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایک تو جب افغانستان کے نوے فیصد علاقے پر طالبان کا قبضہ ہوا تو وہاں امن

قائم ہو گیا۔ چوری، ڈکیتی، قتل و غارت، بدکاری اور زنا بالجبر کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ ملا عمر کے ایک ہی حکم پر پوست کی کاشت بند ہو گئی۔ اب کفر کے ایوانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجیں کہ یہ کیا معاملہ ہے: ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد

حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد!

ہم جس سے ڈر رہے تھے، جس کا ہمیں خوف اور اندیشہ تھا وہی حقیقت سامنے آ رہی ہے۔ حالانکہ ابھی تو پورے نظام کی بات نہیں ہوئی تھی، صرف چند اسلامی سزائیں نافذ کی گئی تھیں۔ ہم خود جب وہاں پر ایک وفد لے کر گئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی کوئی پارلیمنٹ، مجلس شوریٰ یا مجلس ملی ہے؟ کہنے لگے نہیں، کوئی نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی معاشی نظام کا نقشہ ان کے سامنے تھا۔ میں نے پوچھا: آپ کے ہاں بینک ہیں؟ جواب ملا: نہیں۔ میں نے پوچھا آپ اپنا پیسہ کہاں رکھتے ہیں؟ کہنے لگے ہمارے پاس پیسہ ہے ہی نہیں۔ یعنی وہاں کوئی نظام قائم کرنے کی بات نہیں تھی، لیکن چور کا ہاتھ کاٹنا، زانی کو رجم کرنا، قتل کے بدلے قتل جیسی سزائیں سر عام دی جاتی تھیں۔ ایک صاحب نے آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کیا کہ جب ایک شخص نے کسی دوسرے شخص کو سینے میں خنجر گھونپ کر قتل کیا تو اس کو پکڑ کر اور رسیوں سے باندھ کر ایک سٹیڈیم کے اندر ڈال دیا گیا۔ چاروں طرف لوگ کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ اب مقتول کی بیوی کے ہاتھ میں خنجر دے کر کہا گیا کہ اس کے سینے کے اندر گھونپو۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ یہ مناظر دیکھنے کے بعد کیا کہیں کوئی جرم باقی رہ سکتا ہے؟ اس اعتبار سے مغربی دنیا نے بڑا شدید خطرہ محسوس کیا۔

البتہ یہ ضرور نوٹ کر لیجیے کہ اس ابتدائی عرصے میں طالبان سے کچھ غلطیاں بھی ہوئیں۔ پہلی بات یہ کہ نہ ان کی کوئی تعلیم ہوئی تھی، نہ تربیت، نہ تنظیم اور نہ کوئی ڈسپلن قائم ہوا تھا۔ لہٰذا ان سے بڑی بڑی غلطیاں ہوئیں، مثلاً مزار شریف میں ایران کے سفارت خانے پر حملہ کر کے سفارت کاروں کو قتل کر دیا گیا۔ پھر یہ کہ ان کے اندر مذہبی شدت پسندی بہت تھی۔ وہ کٹر حنفی تھے اور ان میں کسی قدر تشدد کا عنصر بھی پایا جاتا تھا۔ تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باعث بعض معاملات میں ان کی سوچ انتہا پسندانہ تھی۔ مثلاً داڑھی چونکہ سنت

*

مؤکدہ ہے اس لیے جو نہیں رکھتا اسے سزا دی جائے۔ حجام اگر شیونگ کرتا ہے تو اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ اسی طرح پردے کا شدت کے ساتھ نفاذ کیا گیا۔ عورتیں اپنے گھروں میں رہیں یا پھر پورا برقع لے کر باہر نکلیں۔ اس حوالے سے تشدد پسندی بھی ہوئی ہے، کچھ غلطیاں اور زیادتیاں بھی ہوئی ہیں۔ کچھ انتہائی تنگ نظر مذہبیت بھی تھی۔ یہ حقائق ہمیں ماننے پڑیں گے۔ چنانچہ عالمِ کفر کے اندر خطرے کی گھنٹیاں بج گئیں کہ ع "نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد"۔ وہ خونی جگر رکھنے والا تو سامنے آ گیا، یہی وہ خطرہ ہے جس سے ہم ڈر رہے تھے، کانپ رہے تھے۔

نائن الیون کا ڈرامہ اور اس کے مقاصد

آپ کو معلوم ہو گا کہ جب سوویت یونین کا خاتمہ ہوا اور اس کے بعد نیٹو کو از سر نو آرگنائز کرنے اور توسیع دینے کی باتیں شروع ہوئیں تو کسی نے نیٹو چیف سے پوچھا کہ اب آپ کس لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں؟ آپ کا وہ دشمن جس کے لیے آپ نے سیٹو، سینٹو اور نیٹو جیسے اتحاد بنائے تھے، وہ تو اب ختم ہو گیا اور آپ کے قدموں میں پڑا مدد کی بھیک مانگ رہا ہے۔ اب تمہیں کاہے کا خوف ہے؟ تو اس نے کہا: ہمیں اب اسلامک فنڈامنٹلزم کا خطرہ ہے۔ اس کے لیے انہوں نے اپنی کمر کسنے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ نائن الیون کا حادثہ فاجعہ خود کروایا گیا۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اس میں طالبان کے ملوث ہونے کا تو صفر فیصد بھی کوئی امکان نہیں، القاعدہ کا بھی کوئی حصہ نہیں تھا۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کام کے لیے جن لوگوں کو منتخب کیا گیا اور دنیا کو دکھانے کے لیے سامنے لایا گیا وہ نوجوان پائلٹ تھے جنہوں نے چھوٹے چھوٹے جہازوں پر تربیت حاصل کی تھی اور غالباً ان میں سے کسی کا کوئی تعلق اسامہ بن لادن کے ساتھ تھا، جس پر اس نے یہ کہہ دیا تھا کہ عنقریب ایک بہت بڑا واقعہ ہو گا۔ بس اس حد تک یہ بات صحیح ہے، باقی اسامہ بن لادن کا قطعاً کوئی حصہ نہیں تھا۔

درحقیقت اس کی ساری پلاننگ موساد، نیوکانز (NEO-CONS) اور سی آئی اے نے کی تھی۔ اس لیے کہ انہیں اب افغانستان پر بڑے پیمانے پر فوج کشی کرنے کے لیے ایک بہت بڑی طاقت کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے امریکہ کی رائے عامہ اس وقت تک

تیار نہ ہوتی جب تک کہ کوئی بڑا حادثہ نہ ہو جائے۔ دنیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ ایک فوجی اتحاد قائم کرنے کے لیے بھی ایک بڑے واقعے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہ انہوں نے خود کروایا۔

اس سے پہلے ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اواخر میں امریکہ کے تھنک ٹینکس یہ سوچ رہے تھے کہ ۲۱ ویں صدی میں امریکہ اس گلوب کی سپر پاور کیسے رہے' اپنی موجودہ پوزیشن کو کیسے مضبوط کرے؟ ابھی روس' چین اور بھارت اس کے دائرہ اقتدار سے باہر ہیں۔ لیکن آگے بڑھ کر پوری دنیا پر اپنی طاقت اور کنٹرول کو کیسے برقرار رکھا جائے؟ اسی موضوع پر ان کا ایک مقالہ بھی شائع ہوا تھا:

"America needs a Pearl Harbour."

یہ تاریخی بات سمجھ لیجیے کہ امریکہ دوسری عالمگیر جنگ تک بین الاقوامی معاملات میں کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ دو بڑے سمندروں کے درمیان آرام سے اپنے معاملات میں مگن تھا۔ اِدھر بحر اوقیانوس ہے' اُدھر بحر الکاہل ہے' قریب قریب کوئی دشمن ہے ہی نہیں۔ تو اس نے ساری توجہ اپنے حالات' ماحول اور معیارِ زندگی بہتر بنانے پر مرکوز رکھی۔ دوسری جنگ عظیم میں جب جرمنی اور جاپان اتحادی افواج کا بھرکس نکال رہے تھے تو بڑی شدید ضرورت پیدا ہوئی کہ کسی طرح امریکہ کو آمادہ کیا جائے۔ چنانچہ چرچل امریکہ گیا اور اس نے خوشامدیں کیں۔ یہ بھی کہا کہ جان لو' اگر آج ہم ختم ہو گئے تو اگلا نمبر تمہارا ہو گا' یہ نازی تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔ پھر بھی وہاں کی رائے عامہ جنگ میں کودنے کو تیار نہیں تھی۔ اس دوران جاپانیوں نے ایک فاش غلطی کی۔ ''پرل ہاربر'' ہونولولو کے قریب ایک بہت دور دراز کی بندرگاہ تھی' جہاں امریکہ کا ایک بہت بڑا نیول بیس تھا۔ جاپان نے اچانک اس پر حملہ کیا اور ان کے بے شمار جہاز غرق کر دیے۔ بہت بڑی تعداد میں امریکی فوجی مارے گئے' بہت سے زخمی یا معذور ہوئے۔ اس پر امریکہ کو غصہ چڑھا۔ چنانچہ سویا ہوا شیر جاگا اور دوسری جنگ عظیم کے میدان میں کود پڑا۔ جرمنی کو اسی کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ جب اس کی فوجیں نارمنڈی کے ساحل پر اتریں تو اس کے بعد جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ پھر جاپان پر اس نے ایٹم بم گرا کر اس کا بھرکس نکال دیا!

*

اس اعتبار سے یہ خیال کیا گیا کہ اگر پرل ہاربر جیسا کوئی حادثہ نہیں ہوگا تو امریکن رائے عامہ بیدار نہیں ہوگی اور نہ ہی کانگریس اور سینیٹ اس کے لیے مالی منظوری دینے کو تیار ہوں گے۔ آخر اربوں ڈالر کا معاملہ ہوتا ہے! اس لیے انہوں نے خود امریکہ میں ''پرل ہاربر'' جیسا معاملہ کروایا۔ اس کے بعد پوری دنیا اور سب سے بڑھ کر امریکہ میں دہشت گردی کے خطرے اور خوف کے تحت جس انداز میں سکیورٹی کے اقدامات کیے گئے ہیں' اس کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔ اس حوالے سے کھربوں ڈالر خرچ ہو رہے ہیں۔ ایک ایک شخص کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ فون ٹیپ کرنے کی بھی قانونی طور پر اجازت دے دی گئی' جو اس سے پہلے امریکہ میں نہیں تھی۔ وہاں شخصی آزادیوں کا بڑا چرچا تھا اور اس حوالے سے امریکہ ایک بڑا چمپئن تھا' لیکن اب ان کی ساری پرائیویسی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ ایئرپورٹس پر باہر سے آنے والوں کو تقریباً نیم برہنہ کر کے ان کی تلاش لی جاتی ہے۔ انہوں نے intelligence کا جو نظام بنایا ہے' اس پر ان کا بے شمار خرچ ہوا۔ پھر اس میں عیسائیوں کی صلیبی جنگ کا جذبہ بھی شامل کر دیا گیا۔ کروسیڈ کا لفظ بش نے بھی بولا تھا' لیکن بعد میں کہا گیا کہ غلطی ہوگئی اور یہ لفظ واپس لے لیا گیا۔ فلاڈلفیا' جو امریکہ کا ایک اہم شہر ہے' وہاں سے ایک ماہنامہ The Philadelphia Trumpet شائع ہوتا ہے۔ یہ وہاں کے پروٹسٹنٹس Evengelists جو کہ خاص طور پر انجیل کے پرچارک ہیں' ان کا رسالہ ہے۔ انہوں نے یہ بات لکھ دی تھی' جسے میں نے اپنے دو کتابچوں کے کور پر شائع کیا ہے' کہ:

> *"Most people think the crusades are a thing of the past—— over forever. But they are wrong. Preparations are being made for a final crusade, and it will be the bloodiest of all!."*

اس حوالے سے دنیا میں آخری کروسیڈ کی تیاری ہو رہی ہے۔ یہ اُس رسالے کے مدیر Gerald Flurry کے اپنے الفاظ ہیں اور وہاں پر ایک پورا مکتب فکر ہے' یعنی پروٹسٹنٹس' ان کے اندر خاص طور پر Baptists' اور Baptists کے اندر Evengelists' نیوکانز۔ یہ سب ایک طبقہ ہے جو دراصل یہودیوں کا آلۂ کار ہے۔

بہر حال اس میں صلیبی جنگ کا جذبہ بھی شامل کر دیا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تاریخ انسانی کی عظیم ترین کولیشن (coalition) وجود میں آئی۔ کبھی دنیا میں اتنی بڑی کولیشن نہیں بنی جتنی افغانستان کے خلاف بنی ہے۔ امریکہ کو یورپ اور دوسری ساری مغربی قوتوں کے ساتھ ساتھ روس اور چین کی بھی اشیر باد حاصل ہے۔ پاکستان کو بھی ایک ٹیلی فون کے ذریعے سے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ہمارے صدر مشرف صاحب ایک ٹیلی فون کال پر ہی بتاشے کی طرح بیٹھ گئے۔ اس کے بعد اتحادی افواج نے افغانستان پر جدید ترین ہتھیاروں سے شدید ترین حملہ کیا۔ ڈیزی کٹرز وہ بم ہیں جن کا پہلے نام تک سنا نہیں گیا تھا۔ پھر لیزر گائیڈڈ بم استعمال ہوئے' جن کا نشانہ چوکنے کا سوال ہی نہیں۔ یہ تیس چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر سے گرائے جاتے ہیں۔ کسی اینٹی ایئر کرافٹ گن کی وہاں تک رسائی ہی نہیں۔ اس تباہی سے طالبان کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے تو مختلف علاقوں میں جا کر اپنے قبائل میں پناہ لے لی۔ ان میں جو غیر ملکی تھے' انہوں نے پاکستان کے قبائلی علاقوں خاص طور پر شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان میں آ کر پناہ لے لی۔

اس کے بعد افغانستان میں امریکہ کے قبضے کے خلاف ایک مزاحمتی تحریک یا بغاوت شروع ہو گئی۔ اس کے نتیجے کے طور پر جب یہ عناصر پاکستان میں آئے تو ان کو دیکھ کر پاکستان میں بھی لوکل طالبان پیدا ہو گئے کہ اگر یہ شریعت کے نفاذ کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں تو ہمیں بھی ایسا کرنا چاہیے۔ یہاں کوئی پندرہ سال سے صوفی محمد صاحب کی ایک تحریک چل رہی تھی۔ ابتداء میں وہ پرامن تھی' اگرچہ بعد میں ان کے کنٹرول سے نکل گئی' کیونکہ وہ کوئی منظّم جماعت نہیں تھی۔ وہ اسّی ہزار کا جلوس لے کر دریائے اٹک کے پل تک آ گئے تھے۔ وہاں فوج نے روکا' ورنہ ان کا پروگرام تھا کہ وہ اسلام آباد آ کر پاکستان سیکرٹیریٹ کا گھیراؤ کریں' جیسے کبھی پچاس ہزار شیعوں نے کیا تھا اور ضیاء الحق صاحب کی ناک رگڑوا دی تھی۔ اسی طریقے سے ان کا پروگرام تھا کہ پارلیمنٹ اور حکومت کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ یہاں شریعت نافذ کریں۔ صوفی محمد صاحب کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ معاملہ اس طرح نہیں چل سکے گا۔ انہوں نے اپنے ان لوگوں سے جو پہاڑوں پر

*

مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے تھے' کہا کہ نیچے اتر آئیں۔ اس پر ان میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ یہ مولوی بک گیا ہے' اسے حکومت نے خرید لیا ہے۔ بعد میں یہ تحریک بیٹھ گئی اور صوفی محمد صاحب گرفتار کر لیے گئے۔ وہ جیل میں پڑے رہے' لیکن اسی تحریک کی کوکھ سے سوات میں پاکستان کے طالبان وجود میں آ گئے۔ یہ سب سے پرامن علاقہ تھا اور سیاحوں کی جنت کہلاتا تھا۔ ان کے قائد مولوی فضل اللہ ہیں جو صوفی محمد صاحب کے داماد ہیں۔ یہ میں نے آپ کے سامنے پس منظر رکھ دیا کہ طالبان کی صورت حال کیا ہے' وہ کہاں سے آئے ہیں اور کن درجوں میں تقسیم ہوئے ہیں۔

افغانستان اور پاکستان کی موجودہ صورت حال کا تجزیہ

اب میں تجزیہ کر کے بتا دیتا ہوں کہ اس وقت صورت حال کیا ہے۔

(**۱**) افغانستان میں شورش (insurgency) کے حوالے سے تین عناصر جمع ہیں:

(i) حقیقی اور سچّے (genuine) طالبان' جو اخلاص کے ساتھ امریکہ سے آزادی اور ملک میں شریعت اسلامی کے نفاذ کی خاطر میدانِ عمل میں ہیں۔ یہ لوگ غلبۂ اسلام اور اسلامی حکومت کے قیام کے خواہش مند ہیں اور اس کے لیے تن من دھن لگا رہے ہیں' جان و مال کی قربانیاں دے رہے ہیں۔ یہ لوگ افغانستان کی آزادی کے لیے بھی لڑ رہے ہیں کہ یہاں امریکی تسلط کیوں قائم ہو گیا ہے۔ اگر وہ روس کے خلاف کھڑے ہو گئے تھے تو امریکہ کے خلاف کیوں کھڑے نہ ہوتے؟ دوسرے یہ کہ ان کے پیش نظر اسلامی حکومت کا قیام ہے' جیسا کہ ملا عمر کی حکومت بنی تھی اور اس میں اسلامی حکومت کا ایک نقشہ نظر آ گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں کچھ نقشے تو بالکل خلافت راشدہ والے تھے۔ جیسے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کسی چٹائی پر بیٹھ کر حکومت کر رہے تھے اسی طرح ملا عمر کو ٹوٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھ کر حکومت کرتے ہم خود دیکھ کر آئے تھے۔ ان کا کوئی محل نہیں تھا' جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کوئی محل نہیں تھا۔ جب ہم وہاں گئے تو قندھار کے گورنر ملا رحمانی مہمانوں کی اس طرح خدمت کر رہے تھے جیسے کوئی خدمت گار ملازم ہو۔ ان کے پاؤں میں ٹوٹے ہوئے چپل تھے۔ چنانچہ جو واقعتاً حقیقی طالبان ہیں وہ اب بھی افغانستان میں اسلام کے غلبے کی جدوجہد کر رہے ہیں اور جانیں دے رہے ہیں۔

(ii) افغان حریت پسند جو پہلے روس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے وہ اب امریکہ کے خلاف کھڑے ہو گئے ہیں۔ ان میں کوئی گہری مذہبیت نہیں ہے' تاہم جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں' افغان قوم کی گھٹی کے اندر اور ان کے کلچر میں مذہب موجود ہے' چاہے آپ اسے صرف رسومات (rituals) والا مذہب کہہ لیں۔ ان کے اندر جذبۂ حریت بھی موجود ہے اور یہ لوگ نہ تو روس کے غلام بننے کے لیے تیار تھے اور نہ ہی اب امریکہ کے غلام بننے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں۔

(iii) وہاں پر جنگجو سردار (War lords) ہیں' جو حکومت کے خلاف اور امریکہ کے خلاف کارروائیاں کر رہے ہیں۔ ان میں کئی گورنرز بھی شامل ہیں۔ وہ اصل میں نہیں چاہتے کہ افغانستان میں کوئی مضبوط حکومت قائم ہو جائے۔ انہیں اندیشہ ہے کہ مضبوط حکومت قائم ہونے کی صورت میں ان کے اختیارات ختم ہو جائیں گے۔ وہ کسی حکومت کے کنٹرول میں آ جائیں گے تو ان کے اللے تللے' ان کے گلچھرے' ان کا ہیروئن کا کاروبار اور اسلحہ کی تجارت سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ ان کے پردے میں غنڈے اور جرائم پیشہ لوگ بھی کارروائیوں میں مصروف ہیں' جو کبھی لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے طالبان کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ تو یہ تیسرا عنصر ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ امریکہ افغانستان میں موجود رہے' لیکن پورے طریقے سے مستحکم نہ ہو' تاکہ یہ سلسلہ چلتا رہے۔ اس طرح ایک تو ہماری من مانیاں جاری رہیں گی' کوئی چیک کرنے والا ہی نہیں ہوگا' اور دوسرے یہ کہ باہر سے تعمیر نو کے نام پر جو پیسہ آ رہا ہے اس کا بھی بڑا حصہ ہماری جیبوں میں جاتا رہے گا۔ کچھ تھوڑا بہت تعمیری کاموں پر بھی خرچ ہو جائے تو ٹھیک ہے' افغانستان کا بھلا ہو جائے گا' کچھ مدرسے' کچھ سکول' کچھ ہسپتال اور کچھ سڑکیں بن جائیں۔ افغانستان میں ''تعمیر نو'' کے لیے جو پیسہ باہر سے آتا ہے اس کا بڑا حصہ تو کابل میں بیٹھے ہوئے حکومت میں شامل لوگ لے جاتے ہیں اور پھر بہت سارا پیسہ ان جنگجو سرداروں کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔ اس لیے کہ مختلف علاقوں میں تعمیراتی کاموں پر خرچ کرنا ان وار لارڈز اور گورنرز کے بغیر تو ممکن نہیں ہے۔ اس وجہ سے وہ یہ چاہتے ہیں کہ افغانستان میں موجودہ حکومتی سسٹم برقرار رہے۔ اسی صورت میں ان کو من مانی کرنے کی پوری آزادی ہے۔

*

اس صورت حال میں یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ کون کیا ہے؟ (Who is who) میں نے نظری طور پر ان عناصر کو تین حصوں میں تقسیم کر کے دکھا دیا ہے۔ سُچّے (genuine) طالبان‘ حریت پسند افغان اور تیسرے یہ شیطان جو وہاں کے وارلارڈز ہیں‘ ہیروئن اور اسلحہ کا کاروباران کا دھندا ہے۔ لیکن کون کیا ہے؟ اس کے بارے میں وہی بلھے شاہ والی بات کہوں گا کہ ع ’’کون دلاں دیاں جانے ہُو!‘‘ کس کو پتا کون کیا ہے! یہ سب عناصر ’’طالبان‘‘ کے پردے میں اپنا اپنا کام کررہے ہیں۔ ہوسکتا ہے انہی میں سے بعض لوگ ہمارے ہاں آ کر طالبان کے نام پر چندے بھی کر کے لے جاتے ہوں‘ واللہ اعلم!

(۲) اسی طرح صوبہ سرحد میں اس وقت جو شورش اور بدامنی (insurgency) برپا ہے اس میں بھی واضح طور پر تین عناصر ہیں:

(i) وہی حقیقی اور سُچّے (genuine) طالبان‘ جو افغانستان میں بھی مجاہدین کی مدد کرتے ہیں اور پاکستانی طالبان کی حیثیت سے اس ملک میں بھی اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض جذباتی عناصر بھی شامل ہیں‘ جو عام طور پر زیادہ پڑھے لکھے لوگ نہیں ہیں‘ اور یہ پاک فوج کے امریکی ایجنڈے پر عمل پیرا ہونے اور خاص طور پر لال مسجد کے سانحہ فاجعہ کے ردِعمل میں عسکریت اور دہشت گردی کی راہ پر چل پڑے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر عمل کا ایک ردِّعمل تو ہوتا ہے‘ جو اُس عمل کے برابر اور مخالف سمت میں ہوتا ہے۔ ان کے علاقوں پر امریکہ کی شدید بمباری ہورہی ہے۔ پھر پاکستانی فوج وہاں کا ہے کے لیے آئی ہے؟ ظاہر ہے وہ امریکہ کی خوشنودی کی خاطر انہی مجاہدین کو ختم کرنے کے لیے کارروائیاں کررہی ہے۔ حالانکہ ان مجاہدین کو خود امریکہ یہاں لے کر آیا تھا اور پاکستان کی حکومت نے ان کی پشت پناہی کی تھی۔ اب انہی کو دہشت گرد قرار دے کر قربانی کا بکرا بنایا جارہا ہے اور پکڑ پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا جارہا ہے۔ اس پر ان لوگوں کو غصہ آئے گا یا نہیں؟ اور نتیجتاً پاکستانی فوج کے خلاف نفرت پیدا ہوگی یا نہیں؟ یہ غصہ اور نفرت ایک فطری ردِّعمل ہوگا۔ کسی مدرسے پر حملہ ہوگیا اور اسّی بچے ختم ہوگئے‘ کہیں کسی آبادی پر حملہ ہوا‘ کسی بارات کے اوپر حملہ ہوا اور پوری بارات ختم ہوگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ! تو ان طالبان کے اندر ان کارروائیوں کا ایک ردِعمل ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان طالبان کا

کوئی اور مقصد نہیں ہے سوائے اس کے کہ یہاں اسلام آئے۔

(ii) وہاں پر جرائم پیشہ لوگ بھی کارروائیوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ طالبان کے پردے میں لوٹ مار بھی کرتے ہیں اور اغوا برائے تاوان کے ذریعے دولت حاصل کرتے ہیں۔ انہیں موقع مل گیا ہے کہ جو کچھ بھی کریں الزام طالبان پر آئے گا۔ انہیں تو ایک کور مل گیا ہے اور ان کے لیے گویا یہ ایک طرح کی گھات بن گئی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو انتہائی بدامنی پیدا کرنے والے اور انتہائی شقی القلب ہیں۔ پاکستان کے فوجیوں کو ذبح کرنے کا معاملہ یہی لوگ کرتے ہیں' طالبان نہیں کرتے۔ مینگورہ میں رہنے والے ہمارے بعض دوستوں نے بتایا ہے کہ ان جرائم پیشہ لوگوں کی طرف سے جس طرح کی درندگی کا مظاہرہ ہوتا ہے اس طرح کا ظلم' زیادتی اور تشدد دنیا میں کبھی بھی نہیں دیکھا گیا۔ اور اِن کے چہروں سے یہ پہچاننا ممکن نہیں ہے کہ یہ دراصل کون لوگ ہیں!

(iii) ان میں را' موساد اور سی آئی اے کے ایجنٹ بھی شامل ہیں' جو پاکستان میں بدامنی پیدا کر کے اسے غیر مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔ امریکہ اپنی گرینڈ سکیم اور گرینڈ پلان کے تحت پاکستان کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ اس کا منصوبہ یہ ہے کہ پاکستان اگر باقی بھی رہ جائے تو اس کے ایٹمی دانت نکال دیے جائیں۔ یعنی اس کے ایٹمی اثاثوں پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس کے لیے وہ چاہتا ہے کہ پاکستان میں بدامنی ہو' ایک سول وار کی کیفیت پیدا ہو جائے' تاکہ مغرب سے NATO فورسز اور مشرق سے بھارتی افواج کے پاکستان میں داخل ہونے کو جواز مل جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پہلے بھی یہ دونوں فورسز ہوشیار کر دی گئی تھیں اور بھارت نے اپنی افواج کو یہ کہہ کر الرٹ کر دیا تھا کہ تیار رہو' ہوسکتا ہے کہ عنقریب ہمیں ایک پڑوسی ملک کے اندر وہاں امن قائم کرنے کے لیے داخل ہونا پڑے۔ امریکہ اور بھارت پاکستان کو destabilize کرنے کے لیے ان عناصر کی پیسے اور ہتھیاروں سے مدد کر رہے ہیں جو ان کے آلۂ کار اور ایجنٹ بن کر کام کر رہے ہیں۔

اسی ضمن میں اس وقت بہت خطرناک صورت حال پاراچنار کے علاقے میں مذہبی بنیادوں پر فسادات کی صورت میں پیدا کر دی گئی ہے۔ اس علاقے میں شیعہ سنی فسادات تو اس سے پہلے بھی ہوتے تھے' لیکن اتنے کبھی بھی نہیں ہوئے جتنے بڑے پیمانے پر اب ہو

*

رہے ہیں، جن میں بڑی خونریزی ہورہی ہے، کشت وخون ہورہا ہے، ایک دوسرے کے لوگ مارے جارہے ہیں۔ اسی طرح باڑا اور اس سے آگے کا جو علاقہ ہے اس میں سنیوں کے دو گروہ دیوبندی اور بریلوی ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو گئے ہیں۔ یہ دونوں انتہائی خطرناک جنگیں ہیں، جو امریکہ اور بھارت کے ایجنٹوں کے ذریعے پاکستان میں پھیلائی جا رہی ہیں۔ یہ آگ آگے بڑھ کر پورے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے اور یہ polarization پورے ملک کے اندر آ سکتی ہے۔ نتیجتاً شیعہ سنی فسادات اور دیوبندی بریلوی فسادات پورے پاکستان میں پھیل سکتے ہیں۔ تو یہ تیسرا عنصر ہے کہ امریکہ اور بھارت چاہتے ہیں کہ کچھ ایسی صورت بن جائے کہ ہمیں پاکستان میں داخل ہونے کا جواز مل جائے۔ کنڈولیزا رائس نے جب بھارت اور پاکستان کا دورہ کیا تھا تو واپس امریکہ جا کر یہ بیان دیا تھا کہ ’’پاکستان کا مستقبل بھارت اور امریکہ مل کر طے کریں گے‘‘۔

تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں!

اب امریکہ ایسا عالمی بدمعاش بن چکا ہے جسے کسی کا ڈر نہیں۔ دنیا پہلے ’’بائی پولر‘‘ تھی تو امریکہ کو یہ ڈر رہتا تھا کہ ہم کسی پر زیادتی کریں گے تو وہ روس کا ساتھی بن جائے گا اور اس کی طاقت بڑھ جائے گی۔ اس اعتبار سے وہ بائی پولر دنیا چھوٹی قوموں کے لیے، چھوٹے ملکوں کے لیے بہت ہی سازگار معاملہ تھا۔ اب دنیا ’’یونی پولر‘‘ ہے۔ پرانی کہاوت ہے: ’’سیاں بھیے کوتوال اب ڈر کاہے کا!‘‘ لہٰذا اب وہ کھل کر باتیں کرتے ہیں اور اپنے منصوبے علی الاعلان واضح کرتے ہیں۔ امریکہ کی طرف سے مشرقِ وسطیٰ کا آئندہ کا نقشہ شائع ہو گیا ہے، جس میں گریٹر کردستان دکھایا گیا ہے، جو ترکی کے کچھ علاقے، عراق کے شمالی علاقے اور ایران کے شمال مغربی حصے پر مشتمل ہوگا۔ گریٹر بلوچستان تو ہمیشہ سے ان کے پروگرام میں شامل ہے۔ اس میں صرف ہمارا بلوچستان نہیں، بلکہ کچھ ایرانی بلوچستان، کچھ افغانی بلوچستان اور کچھ پنجاب کے اضلاع بھی شامل ہوں گے۔ خاص طور پر ڈیرہ غازی خان تو بلوچ علاقہ ہے۔ اس کے علاوہ سندھ کا بالائی یعنی شمالی علاقہ جیکب آباد وغیرہ بھی بلوچ علاقہ ہے۔ ان سب علاقوں کو ملا کر گریٹر بلوچستان کا قیام ان کا منصوبہ ہے۔

باقی عراق کے بارے میں ان کا منصوبہ یہ ہے کہ اس کے تین ٹکڑے ہو جائیں گے‘ جن میں سے ایک ٹکڑا کردستان کے ساتھ جائے گا۔ اس طرح ایک سنی سٹیٹ اور ایک شیعہ سٹیٹ بنے گی۔ شیعہ سٹیٹ کی نیچے جا کر دو طرف سے توسیع ہو جائے گی۔ جیسے شلوار یا پاجامہ کی شکل ہوتی ہے کہ اوپر سے ایک ہوتا ہے اور نیچے اس کی دو ٹانگیں بن جاتی ہیں۔ چنانچہ خلیج کے اوپر تو وہ ایک ریاست ہوگی‘ جس میں کویت بھی شامل ہوگا اور عراق کا جنوبی حصہ بھی جو شیعوں پر مشتمل ہے‘ لیکن نیچے ایک پٹی خلیج فارس کے مشرقی ساحل کے ساتھ ہو گی جہاں شیعہ عرب آباد ہیں۔ اس طرح خلیج کے مغربی ساحل کے ساتھ بھی ایک پٹی کاٹ لی جائے گی۔ یہ بھی شیعہ عرب ہیں۔ تو اس طرح گویا ایک یونائیٹڈ عرب شیعہ سٹیٹ بنانے کا پروگرام ہے۔ باقی جو عرب ہے اس کو تقسیم کر دیں گے۔ نجد علیحدہ ہو جائے گا۔ بس یوں سمجھئے کہ جیسے عیسائیوں کی ایک چھوٹی سی مذہبی ریاست ''ویٹی کان'' ہے‘ اس سے ذرا بڑی ریاست مکہ‘ مدینہ اور ینبوع وغیرہ کو ملا کر مسلمانوں کی ایک مذہبی ریاست بنا دیں گے‘ باقی سارے علاقے علیحدہ رہیں گے۔ یہ سارے نقشے ہیں جو بن رہے ہیں۔

ان کے منصوبے کے مطابق پاکستان کے صوبہ سرحد کو افغانستان کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا اور افغانستان کا شمال مغربی حصہ ایران کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا۔ وہ تو یوں سمجھتے ہیں کہ یہ سارا علاقہ ہمارا ہے‘ آج نہیں تو کل ہم نے ہی اس کو کنٹرول کرنا ہے۔ یہاں ہمارا ہی حکم چلے گا‘ ہماری مرضی چلے گی۔ ہم جیسے چاہیں گے نئی لکیریں کھینچ دیں گے۔ جیسے پہلی جنگ عظیم کے بعد پوری عرب دنیا کو تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اُس وقت یہ سعودی عرب‘ اردن‘ شام‘ مصر اور لیبیا وغیرہ علیحدہ علیحدہ ممالک نہیں تھے‘ بلکہ عظیم سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھے۔ یہ سارا شام‘ سارا فلسطین‘ سارا لبنان‘ سارا اُردن‘ حجاز کا بہت بڑا حصہ اور پورا شمالی افریقہ‘ یہ سب خلافت عثمانیہ کے تحت تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد مغربی ممالک نے مل بیٹھ کر ان کے حصے بخرے کیے ہیں‘ ان کی balkanization کی ہے۔ جیسے آنحضور ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ دنیا کی قومیں تم پر ٹوٹ پڑیں گی اور اس طرح ایک دوسرے کو دعوت دیں گی جیسے دستر خوان پر مہمانوں کو بلایا جاتا ہے کہ آئیے کھانا تناول فرمائیے۔ واقعہ یہ ہے کہ مغربی اقوام نے عالمِ اسلام کے اسی طرح حصے بخرے کیے

*

تھے کہ لبنان فرانس کا ہے' مصر اور عراق انگریزوں کے ہیں' لیبیا اطالویوں کو دے دو اور الجزائر بھی فرانسیسیوں کو دے دو! یہ تقسیم اتنی پرانی نہیں ہے' اس واقعہ کو ابھی سو سال بھی نہیں ہوئے جبکہ یہ ساری تقسیم ہوئی ہے' ورنہ ان علیحدہ علیحدہ ملکوں کا کوئی نظام تھا ہی نہیں۔ انہیں خلافت عثمانیہ سے کاٹا گیا اور ان میں پھر علاقائی قومیتوں کے بیج بوئے گئے کہ مصر مصریوں کا ہے اور شام شامیوں کا ہے۔ خود ترکی میں تو مصطفیٰ کمال پاشا نے پورے دین و مذہب کی جڑیں کھود کر ترک نیشنلزم کی بنیاد رکھی اور اسے اس قدر سو فیصد خالص سیکولر ملک بنا دیا کہ اتنا سیکولر ملک دنیا میں کوئی اور ہے ہی نہیں۔ ہر ملک کا کوئی نہ کوئی سرکاری مذہب ہوتا ہے' ترکی کا سرے سے نہیں ہے۔ وہاں کے دستور میں ہر شق بدلی جا سکتی ہے لیکن سیکولرزم کی شق تبدیل نہیں کی جا سکتی۔ اگر کسی حکومت نے اس کے خلاف کوئی اقدام کیا تو فوراً فوج از روئے دستور اقتدار پر قبضہ کر لے گی۔

پاکستان کے اندر کی صورت حال میں بیان کر چکا ہوں کہ افغانستان کی طرح یہاں بھی تین قوتیں برسرپیکار ہیں اور یہاں بھی وہی بات ہے کہ کون کیا ہے' کچھ معلوم نہیں۔ بیت اللہ محسود کیا ہے؟ کوئی آ کر بتاتا ہے کہ وہ تو غنڈہ' بدمعاش اور ڈاکو ہے۔ کوئی آ کے بتاتا ہے کہ نہیں بھئی وہ تو ایک واقعی سُچّا طالبان ہے اور وہ ملا عمر کا تابع فرمان ہے۔ کون کیا ہے؟ (Who is who?) اس کو جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ''کون دلاں دیا جانے ہُو؟'' لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کوئی ایک بسیط معاملہ (phenomenon) نہیں ہے' بلکہ بڑی پیچیدہ صورت حال ہے۔ امریکہ اور بھارت اس کوشش میں ہیں کہ یہاں پر خانہ جنگی ہو۔

عالمی منظر نامہ

یہ تو ہے علاقائی سیناریو (منظر نامہ) جو میں نے آپ کے سامنے رکھ دیا۔ اب آیئے ذرا عالمی منظر پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ اگرچہ میں اس موضوع پر تقریریں کر چکا ہوں' لیکن آج پھر اس گفتگو کے حوالے سے بعض چیزیں تازہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت عالمی سطح پر پورا عالم مغرب (یہودی + عیسائی) اور (امریکہ + یورپ) یہود کا آلۂ کار بن چکے ہیں۔ ان کے اہداف کے پیچھے اصل ماسٹر مائنڈ اور سازشی ذہن یہود کا ہے۔ اس وقت

عیسائی یہودیوں کے آلۂ کار ہیں اور ان میں سے بھی پروٹسٹنٹس (Protestants) سو فیصد آلۂ کار ہیں۔ پروٹسٹنٹ ازم دراصل یہود ہی نے پیدا کروایا تھا۔ یہود ہی نے یورپ کے اندر سود کا رواج شروع کروایا' ورنہ کلیسا کے نزدیک سود حرام تھا۔ وہاں پر یوژری (usury) اور کمرشل انٹرسٹ دونوں حرام تھے۔ اسے یہودیوں نے حلال کروایا۔ پھر یہودیوں نے انگلستان کے اندر پہلا بینک ''بینک آف انگلینڈ'' بنوایا۔ پروٹسٹنٹ فرقے سے پوپ کے خلاف بغاوت کرائی تو پہلی بغاوت انگلستان ہی کے اندر ہوئی اور ''چرچ آف انگلینڈ'' پوپ سے علیحدہ ہو گیا۔ چنانچہ برطانیہ کو یہودیوں نے قرار دیا کہ یہ ہمارا ماڈرن اسرائیل ہے' جو ہمیں خدا نے دیا ہے۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد وہ امریکہ میں جا کر آباد ہوئے اور اب انہوں نے امریکہ کو اپنا اصل ماڈرن اسرائیل قرار دیا۔ اس لیے کہ انہیں وہاں پر اقتدار حاصل ہوا' قوت حاصل ہوئی' انہوں نے وہاں بے شمار دولت جمع کی' اور وہاں کی حکومتوں کو جس طریقے سے جکڑ لیا اس پر علامہ اقبال کا یہ مصرع راست آتا ہے کہ ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' ٹھیک سو سال پہلے علامہ اقبال یورپ میں یہ مشاہدہ کر کے آ گئے تھے۔ اُس وقت اور کون دیکھنے والا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے' سامنے کیا ہے اور پردے کے پیچھے کیا ہے۔ اُس وقت فرنگ کا امام برطانیہ تھا۔ یہ وہ سلطنت تھی جس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ آج فرنگ کا امام امریکہ ہے۔ برطانیہ کی تو اب یہ مثال ہے' جو ہم نے کہیں بچپن میں ایک نظم میں پڑھی تھی:

London bridge is going down, going down!

برطانیہ کی تو اب کوئی حیثیت ہی نہیں۔ وہ تو امریکہ نے اسے چھوٹا بھائی بنا رکھا ہے' ورنہ کوئی اور حیثیت نہیں۔ بہرحال پیچھے ساری پلاننگ یہود کے سازشی ذہن کی ہے اور آلۂ کار سب سے بڑھ کر امریکہ اور اس کے بعد برطانیہ ہے۔ ان میں بھی اصل آلۂ کار پروٹسٹنٹس ہیں' ان میں خاص طور پر Baptists اور ان سے بھی آگے بڑھ کر Evengelists۔ ان کو ''دوبارہ پیدا شدہ عیسائی'' (Born again Christians) بھی کہتے ہیں اور نیو کنزرویٹو کرسچینز بھی۔ ان کو نیا نام دیا گیا ہے ''عیسائی صیہونی'' (Christian Zionists)۔ ایک یہودی Zionists ہیں۔ بہت سے یہودی صیہونیت (Zionism) کے مخالف

*

2

ہیں۔ چنانچہ ہوسٹن میں میری ملاقات ڈاکٹر وشوگراڈ سے ہوئی تھی جو بہت بڑا پروفیسر ہے۔اس نے بھرے اجتماع میں کہا تھا کہ ہم اسرائیل کے حمایتی نہیں ہیں۔ وہاں پر ہم نے اپنے اجلاس میں ایک یہودی' ایک عیسائی اور ایک مسلمان سکالر کو اظہار خیال کے لیے بلایا تھا۔اس یہودی پروفیسر نے وہاں پر موجود عیسائی پروفیسر کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ:

"They are supporting Israel; We are not supporting Israel."

اسی طرح چند سال پہلے میری جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ہوئی تھی' اس میں ایک یہودی پروفیسر نے واضح طور پر کہا تھا کہ میں صیہونیت (Zionism) کے خلاف ہوں۔ چنانچہ صیہونیت اصل میں سیکولر یہودیوں کی تحریک ہے اور اس کے سب سے بڑے سپورٹرز کرسچین Zionists ہیں جو امریکہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔اگرچہ رومن کیتھولکس بھی اب رفتہ رفتہ ان کے ہم خیال بنتے جا رہے ہیں لیکن یہ زیادہ یہود نواز نہیں ہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ ترکی یورپی یونین کا رکن بننے کی شدید خواہش رکھتا ہے۔اس کے بارے میں ایک بار رومن کیتھولک یاک شیراک نے بڑا پیارا جملہ کہا تھا:

"Why dose not Turky understand that we are a Christian Club?"

یعنی ترکی یہ بات کیوں نہیں سمجھتا کہ یورپی یونین تو ایک کرسچین کلب ہے' جبکہ وہ مسلمان ہے۔وہ اس میں کیوں داخل ہونا چاہتا ہے؟

رومن کیتھولکس چونکہ زیادہ یہود نواز نہیں ہیں لہٰذا یورپ نے عام طور پر اسرائیل کا اتنا ساتھ نہیں دیا جتنا امریکہ دیتا رہا ہے۔ ان کے دلوں میں کسی درجے میں عرب فلسطینیوں کے لیے نرم گوشہ بھی رہا ہے۔ یہ معاملہ ایران کے بارے میں بھی رہا ہے۔ ایران کے خلاف جس قدر سخت ایکشن امریکہ لینا چاہتا ہے یورپ اس کے ساتھ نہیں ہے۔تو یہ تھوڑا سا فرق ہے۔میں اس کی ایک بنیاد بعد میں آپ کو بتا دوں گا۔

یہود و نصاریٰ کا دو نکاتی ایجنڈا

اس وقت پورا عالمِ مغرب اصلاً یہودیوں کے آلۂ کار کے طور پر اور ظاہراً روئے ارضی کی واحد سپریم پاور امریکہ کی قیادت میں دو نکاتی ایجنڈے پر عمل پیرا ہے:

(۱) عالمِ اسلام کے مادّی اور مالیاتی وسائل خصوصاً تیل پر قبضہ۔ یہ ان کا اس وقت کا ایجنڈا ہے۔ ویسے تو وہ اس سے اوپر پوری دنیا کے وسائل پر تسلط چاہتے ہیں' لیکن وہ تو بعد کی بات ہے۔ ابھی وہ نہ روس کو چھیڑ رہے ہیں نہ چین کو۔ چین تو ان کا سب سے بڑا بزنس پارٹنر ہے اور اسے وہ رفتہ رفتہ اپنی لائن پر لا رہے ہیں۔ اب تو چین میں صرف ایک پارٹی گورنمنٹ باقی رہ گئی ہے جو کمیونزم کے دور کی یادگار ہے۔ باقی ان کی معیشت تو اُسی رخ پر آ چکی ہے جو مغرب کی معیشت کا ہے۔

(۲) دنیا میں کہیں بھی اسلام کے سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام کے ظہور کا ہر قیمت پر سدّ باب کرنا' خواہ اس میں کتنا ہی کشت وخون ہو اور کتنا ہی سرمایہ صرف ہو جائے۔

ان کے ایجنڈے کے یہ دونوں حصے باہم دگر مربوط ہیں' جیسے دو لڑیوں کو بٹ دے کر رسّی بنائی جاتی ہے۔ اس وقت مغرب اسلام کے Politico-Socio-Economic System سے خوف زدہ ہے کہ ع ''ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!''

علامہ اقبال نے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کا جو نقشہ اشعار کی صورت میں کھینچا ہے' ان میں ابلیس نے اپنے مشیروں کے سامنے اس اندیشے کا اظہار کیا ہے کہ: ؎

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

کہیں ایسا نہ ہو کہ پیغمبر کی شریعت دنیا کے سامنے آ جائے۔ پیغمبر اسلام کا دیا ہوا معاشرتی نظام کہیں دنیا اختیار نہ کر لے: ؎

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن' مرد آزما' مرد آفریں

اور اسلام کا معاشی اور سیاسی نظام کہیں دنیا میں قائم ہو گیا تو سارے ابلیسی نظام اپنی موت آپ مر جائیں گے: ؎

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں' نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف

*

منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں!

یعنی اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ. یہ نظام نہ آ جائے کہیں دنیا میں! ابلیس اور اس کی صلبی و معنوی ذُریت کو سب سے بڑا خطرہ اسی نظامِ خلافت سے ہے۔ البتہ ابلیس نے اس اعتبار سے اپنے اطمینان کا اظہار کیا ہے کہ:

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مؤمن ہے محرومِ یقیں!

ان کے لیے یہ امر موجب اطمینان ہے کہ خود مسلمانوں کو ہی آئین پیغمبری پر صحیح معنوں میں ایمان و یقین حاصل نہیں ہے۔ انہیں اس کی کوئی پرواہی نہیں کہ اسلام کا بھی اپنا کوئی نظامِ عدلِ اجتماعی یا نظامِ خلافت ہے۔ وہ نماز اور روزے پر یقین رکھتے ہیں' جنہیں اللہ توفیق دیتا ہے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں' حج کرتے ہیں' عمرے کرتے ہیں' لیکن یہ غنیمت ہے کہ اپنے نظام کے بارے میں لاعلمی یا بے یقینی کا شکار ہیں۔

اب میں یہودیوں کے ایجنڈے کا تجزیہ کر رہا ہوں۔ سب سے پہلے ورلڈ بینک' آئی ایم ایف' گلوبلائزیشن اور TRIPS جیسے ہتھکنڈوں کے ذریعے عالمی مالیاتی استعمار' جو بظاہر امریکہ اور حقیقتاً یہود کا ہوگا۔ یہودیوں کے نزدیک پوری نوعِ انسانی حیوانوں کے مانند ہے۔ وہ انہیں Goyims اور Gentiles کہتے ہیں کہ یہ انسان نہیں ہیں' بلکہ انسان نما حیوان ہیں' اور حیوانوں کا استحصال کرنا اور ان سے کام لینا انسانوں کا حق ہے۔ آپ گھوڑے کو تانگے کے آگے باندھ دیتے ہیں اور بیلوں کو ہل کے اندر جوت دیتے ہیں' یہ آپ کا حق ہے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ ان انسان نما حیوانوں سے خدمت لینا اور ان کے وسائل کو اپنے قبضے میں لے لینا ہمارا حق ہے۔ البتہ جیسے گھوڑے اور بیل کو بھی کچھ نہ کچھ چارہ تو ڈالنا پڑتا ہے اسی طرح جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے ہم ان کو بھی کچھ دیتے رہیں گے۔ بہرحال یہود کے ایجنڈے میں یہ بات شامل ہے کہ پوری نوعِ انسانی کو حیوانی سطح پر لا کر ان کا استحصال کیا جائے اور ان کی اخلاقی اقدار کا بیڑا غرق

کر دیا جائے' خاندانی نظام کو تہہ و بالا کر دیا جائے' انہیں شہوت کے غلام بنا دیا جائے۔ چنانچہ پروٹوکولز آف دی ایلڈرز آف دی Zions جو ۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ میں پاس ہوا' اس میں انہوں نے اپنے یہ اہداف معین کیے تھے۔

یہود کا ہدف: عظیم تر اسرائیل کا قیام

یہود کے ایجنڈے کا دوسرا حصہ علاقائی سطح کا ہے' یعنی گریٹر اسرائیل کا قیام' جس میں وہ تمام علاقے شامل ہوں گے جہاں کبھی یہودی قومی طور پر آباد یا مقیم رہے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر میں جا کر آباد ہو گئے تھے جہاں ان کی آئندہ نسلیں پروان چڑھیں۔ چنانچہ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ مصر کا جوشن کا علاقہ جو دریائے نیل کا زرخیز ڈیلٹا ہے' گریٹر اسرائیل میں شامل ہو گا۔ اسی طرح بابل (عراق) کا بادشاہ بخت نصر ۵۸۷ ق م میں ہیکل سلیمانی مسمار کرنے کے بعد لاکھوں یہودیوں کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہودی اس بنیاد پر عراق کو بھی گریٹر اسرائیل کا حصہ بنانا چاہتے ہیں کہ وہاں انہوں نے طویل عرصے تک اسیری کی زندگی گزاری۔ اس کے علاوہ یہ عرب کے شمالی حصے پر بھی قابض ہونے کے خواب دیکھ رہے ہیں' جہاں خیبر میں یہودیوں کے قلعے تھے اور مدینہ منورہ میں ان کے تین قبیلے آباد تھے جنہیں محمد رسول اللہ ﷺ نے وہاں سے نکال باہر کیا تھا۔ مزید برآں یہ فلسطین' شام' لبنان اور اردن تو پورے کے پورے اور ترکی کا مشرقی اور جنوبی حصہ بھی گریٹر اسرائیل میں شامل کرنے کے دعوے دار ہیں۔

یہودی اپنے اس ایجنڈے کی تکمیل کے لیے کوشاں ہیں اور اس کے لیے ایک بہت بڑی جنگ لڑی جائے گی۔ یہ ایک عظیم عالمی جنگ ہو گی' جس کو نبی اکرم ﷺ نے ''الملحمة العظمیٰ'' اور ''الملحمة الکبریٰ'' کا نام دیا ہے۔ اس عظیم جنگ کی خوفناکی اور تباہی کاریوں کا اندازہ اس سے کیجیے کہ حدیث میں آتا ہے کہ اگر ایک باپ کے سو بیٹے یا ایک دادا کے سو پوتے ہوں گے تو ان میں سے ۹۹ ختم ہو جائیں گے' صرف ایک بچے گا۔ اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ اس جنگ میں اتنی اموات ہوں گی کہ ایک نفاست پسند پرندہ (جو گندگی پر نہیں اترنا چاہتا) مسلسل اڑتا چلا جائے گا لیکن لاشوں کا

*

سلسلہ ختم نہیں ہوگا‘ یہاں تک کہ وہ تھک ہار کر لاشوں ہی پر گر جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ اب زیادہ دور نہیں ہے۔ اس پر یہودی اور عیسائی پوری طرح متفق ہیں کہ آرمیگاڈان (Armageddon) ہونے والی ہے‘ جسے آپ تیسری عالمی جنگ کہہ سکتے ہیں۔ اس جنگ کے نتیجے میں گریٹر اسرائیل وجود میں آئے گا۔

گریٹر اسرائیل کے قیام کے بعد یہودی پہلا کام ہیکل سلیمانی کی سہ بارہ تعمیر کا کریں گے‘ جسے ٹائٹس رومی نے ۷۰ عیسوی میں گرا دیا تھا اور اسے منہدم ہوئے تقریباً دو ہزار برس (۱۹۳۸ برس) گزر چکے ہیں۔ تھرڈ ٹمپل کی تعمیر کے لیے وہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ (Dome of the Rock) کو مسمار کریں گے۔ معبد کی تعمیر کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کا تخت یہاں لا کر رکھا جائے گا۔ تخت داؤدؑ دراصل ایک پتھر تھا جس پر تین ہزار سال قبل حضرت داؤد علیہ السلام کی تاج پوشی ہوئی تھی۔ پھر اسی پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی تاج پوشی بھی کی گئی تھی اور ان کے بعد آنے والے یہودی بادشاہوں کی تاج پوشی اسی پر ہوتی رہی۔ ٹائٹس رومی نے ۷۰ عیسوی میں یروشلم کو برباد کیا اور ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس موقع پر ٹائٹس اس پتھر کو اپنے ساتھ روم لے گیا۔ روم سے وہ پتھر کسی طرح آئرلینڈ پہنچ گیا‘ جو بنیادی طور پر رومن کیتھولک ملک ہے۔ وہاں پر پروٹسٹنٹس اور کیتھولکس کی جنگیں اب بھی ہوتی رہتی ہیں۔ شیعہ سنی مسلمانوں کے مابین کبھی اس طور سے خانہ جنگی نہیں ہوئی جیسی کہ وہاں عیسائیوں کے ان دو فرقوں کے مابین ہوتی رہتی ہے۔ آئرلینڈ سے وہ پتھر سکاٹ لینڈ منتقل ہوا۔ پھر چودہویں صدی میں وہ پتھر انگلینڈ آیا تو اسے تخت کی صورت دے دی گئی۔ یعنی تخت کی سیٹ اسی پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ یہ تخت انگلینڈ کی پارلیمنٹ کی عمارت سے ملحقہ چرچ ''ویسٹ منسٹر ایبے'' میں رکھ دیا گیا اور اس وقت سے برطانیہ کے بادشاہوں اور ملکاؤں کی تاج پوشی اسی تخت پر بٹھا کر کی جاتی ہے۔

یہود اور نصاریٰ کے متفرق پروگرام

نوٹ کیجیے کہ یہاں تک عیسائیوں اور یہودیوں کا ایجنڈا ایک ہے‘ لیکن اس کے بعد ان میں اختلاف ہے۔ یہودیوں کے نزدیک ان کا میسایا ح (Messiah) آئے گا اور وہ تخت داؤد پر بیٹھ کر پوری دنیا پر راج کرے گا‘ جس کی پیشین گوئیاں تورات کی ابتدائی

کتابوں میں موجود ہیں اور جس کے وہ منتظر ہیں۔ درحقیقت ان پیشین گوئیوں کا مصداق حضرت مسیح علیہ السلام تھے' لیکن جب وہ آئے تو یہودیوں نے ان کو نہیں مانا' بلکہ معاذ اللہ انہیں جادوگر' کافر' مرتد اور ولد الزنا قرار دیا اور اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھوا دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمان پر اٹھا لیا۔ چنانچہ یہودیوں کے نزدیک ان کے ''میسایاحِ منتظر'' کی اسامی ابھی خالی ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق وہ آئے گا اور اس تخت داؤد پر بیٹھ کر پوری دنیا پر حکومت کرے گا۔

اس ضمن میں عیسائیوں کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول ہوگا تو وہ اس تخت داؤدؑ پر بیٹھیں گے۔ یہ لوگ فلسطین میں ایک رومن کیتھولک حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہودی اپنی حکومت چاہتے ہیں اور وہ اپنی حکومت چاہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ انڈونیشیا کے اندر بھی ایک جزیرے کو تقسیم کر دیا گیا تھا اور اس کا ایک حصہ (مشرقی تیمور) رومن کیتھولک ریاست بن گیا ہے۔ شاید نائیجریا کے کسی علاقے میں بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ ہوا ہے۔ اس اختلاف کے باوجود یہودی اور عیسائی عالمی استیلاء اور مالیاتی استعمار کے ایجنڈے پر متفق ہیں اور اس کے لیے کوشاں ہیں۔ اس پورے ڈرامے کا اسکرپٹ یہودیوں کا لکھا ہوا ہے اور وہی اس کے پس پردہ ہدایت کار ہیں۔ البتہ بظاہر اس ڈرامے کا سب سے بڑا کردار یعنی ہیرو امریکہ ہے اور پورا یورپ اس کے تابع ہے۔

میں نے چار سال پہلے اسی مقام پر دو تقریریں ان ہی موضوعات پر کی تھیں' جو اَب کتابچوں کی صورت میں شائع شدہ ہیں:

(i) پاکستان کے وجود کو لاحق خطرات وخدشات اور بچاؤ کی تدابیر

(ii) موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں اسلام کا مستقبل۔

ان خطابات میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ بالآخر دنیا میں خلافت کا نظام قائم ہوگا۔ عرب میں حضرت مہدی کا ظہور ہوگا اور پھر گریٹر اسرائیل کے خلاف جہاد ہوگا۔ اس جہاد کے نتیجے میں رفتہ رفتہ یہود سے یہ ممالک واپس لیے جائیں گے جن پر ان کا قبضہ ہو چکا ہو گا۔ یہاں تک کہ بالآخر ایک یہودی میسایاح ہونے کا اعلان کر دے گا۔ یہ وہ دجال (Anti-Christ) ہوگا جس کی خبریں احادیث میں دی گئی ہیں۔ کیتھولک عیسائیوں اور

*

Baptists کا بھی یہی نظریہ ہے کہ اینٹی کرائسٹ یہودی ہو گا۔ کچھ عرصہ پہلے بہت بڑا پروپیگنڈا ہوا تھا کہ اینٹی کرائسٹ (دجال) مسلمان ہو گا۔ لیکن عیسائیوں کا اصل موقف یہی ہے کہ وہ یہودی ہو گا۔ پھر حضرت مسیح علیہ السلام کا آسمان سے نزول ہو گا اور ان کے ہاتھوں دجال قتل ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے ہاتھوں ایک ایک یہودی قتل ہو گا۔ پھر حضرت مسیحؑ کے ہاتھوں ایک عالمی اسلامی ریاست قائم ہو گی۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام چالیس برس تک پوری دنیا پر حکومت کریں گے۔ بہرحال یہ جو تصویر کا دوسرا رخ ہے' میں اِس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جا رہا۔ تصویر کا جو رخ سامنے ہے وہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔

افغانستان پر امریکی حملے کا اصل سبب

اب ذرا تجزیہ کیجیے کہ افغانستان پر امریکی حملے کا اصل سبب کیا تھا۔ میں نے یہود و نصاریٰ کے ایجنڈے کے دو حصے بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا میں اسلام کہیں ظاہر نہ ہو جائے' اسلام کا نظام کہیں قائم نہ ہو جائے اور دوسرے مسلمانوں کے مالیاتی خاص طور پر تیل کے وسائل پر قبضہ۔ افغانستان میں جو کچھ ہوا ہے یہ سارا معاملہ اسلام کا راستہ روکنے کے لیے تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ یہاں اسلام اپنی صورت ظاہر کر رہا ہے اور اگر طالبان کو موقع مل گیا تو یہ ایک فلاحی ریاست قائم کر دیں گے۔ یہاں زکوٰۃ کا نظام قائم ہو گیا تو اعلیٰ ترین ویلفیئر سٹیٹ قائم ہو جائے گی' اور اگر یہاں پر اسلامی حدود و تعزیرات کا نفاذ ہو گیا تو معاشرہ جرائم سے پاک ہو جائے گا' لوگوں میں محبت ہو گی' مساوات ہو گی اور عام لوگوں کے لیے ویلفیئر کا نظام ہو گا۔ اور یہ نظام دنیا کے سامنے آ گیا تو پھر ہمارا سرمایہ دارانہ نظام کہاں رہے گا؟ اس کو تو کہیں منہ چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔ لہٰذا افغانستان پر حملے کا اصل محرک یہ ہے۔ البتہ ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر تھا کہ افغانستان کے راستے سے سنٹرل ایشیا کی ریاستوں سے تیل اور گیس کی پائپ لائنیں گوادر کے آس پاس سمندر تک لائی جائیں' تاکہ وسط ایشیا کی مسلمان ریاستوں کے تیل اور گیس کے ذخائر تک رسائی حاصل کی جا سکے۔ قبل ازیں وہ طالبان کے زمانے میں اس کی کوشش کر چکے تھے۔ ان کی سب سے بڑی کمپنی UNICOL نے طالبان سے مذاکرات کیے تھے' لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ

گئے کہ یہ ملّا ملاٹے تو سودے بازی (bargaining) میں بڑے سخت گیر ہیں۔ طالبان نے ان کے ساتھ اس طریقے سے پاؤں جما کر مذاکرات کیے اور اپنی شرائط پیش کیں کہ وہ گھبرا اٹھے اور مایوس ہو کر بھاگ گئے۔ چنانچہ افغانستان پر قبضہ کرنے میں اگرچہ ایک محرک یہ بھی تھا‘ لیکن اس کی حیثیت ثانوی تھی‘ اصل محرک یہ تھا کہ وہ اسلام کے نظامِ خلافت کی کوئی صورت دنیا کے سامنے نہ آنے دیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس معاملے میں پورا عالمِ کفر جمع ہے۔ امریکہ‘ یورپ‘ روس‘ چین اور بھارت سب یکجا ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا جب ہمارے ہاں لال مسجد کا حادثہ ہوا اور ہمارے بدبخت اور بدمعاش صدر نے خود جان بوجھ کر ایک پھنسی کو بڑھا کر پھوڑا بنایا اور پھر اس میں شگاف دیا تو اس پر دنیا بھر سے شاباش لی۔ اسے امریکہ سے‘ یورپ سے‘ نیٹو سے‘ روس سے اور چائنا سے شاباش موصول ہوئی۔ وہ شخص اُس وقت محسوس کر رہا تھا کہ اندرونِ ملک تو اب میری کشتی ڈانواڈول ہے لہٰذا مجھے عالمی قوتوں کی اشیر باد حاصل کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس نے دنیا کو یہ باور کرایا کہ پاکستان کے عین قلب میں بنیاد پرستی‘ شدت پسندی‘ تنگ نظری اور دہشت گردی کا یہ پھوڑا نکل آیا تھا اور دیکھو کہ میں نے کس قدر سفاکی اور بے رحمی سے اس میں چیرہ دیا ہے‘ کتنے لوگوں کو ختم کر دیا ہے!

یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ افغانستان کے بارے میں اور قربِ قیامت کی جنگوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی جو احادیث ہیں وہ یہودیوں کے علم میں ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((يَخْرُجُ مِنْ خُرَاسَانَ رَايَاتٌ سُودٌ لَا يَرُدُّهَا شَيْءٌ حَتّٰى تُنْصَبَ بِإِيلِيَاءَ))(۱)

’’خراسان کے علاقے سے کالے جھنڈے لے کر فوجیں چلیں گی‘ کوئی طاقت ان کا رخ نہیں موڑ سکے گی‘ یہاں تک کہ وہ جھنڈے بیت المقدس میں گاڑ دیے جائیں گے۔‘‘

انہیں یہ خوب معلوم ہے۔ اس لیے کہ یہ بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ ان کے علم کا اندازہ اس واقعے سے کیجیے کہ جب ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں یہودیوں کو بہت بڑی فتح

---

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الفتن۔ ومسند احمد : ۷۵۵۷۔

*

6

ہوئی اور انہوں نے اردن سے مشرقی یروشلم بھی چھین لیا اور اس طرح پورا یروشلم اور بیت المقدس ان کے قبضے میں آ گیا تو اس موقع پر جب اسرائیلی وزیر دفاع موشے دایان فاتح کی حیثیت سے مشرقی بیت المقدس میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ موجود چیف ربائی (RABBI) رو پڑا۔ یہ وقت یہودیوں کے لیے فتح کی خوشی کا تھا' لیکن ان کے چیف ربائی نے روتے ہوئے یہ کہا تھا:

"So this is the beginning of the end."

یعنی یہ تو خاتمے کا آغاز ہے۔اس کے یہ الفاظ اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔گویا اب یہ آخری ڈرامہ شروع ہو گیا ہے اور ان کو معلوم ہے کہ یہ آخری ڈرامہ ان کی تباہی پر ختم ہونا ہے۔ Evengelists کے ترجمان ماہنامہ "The Philadelphia Trumpet" میں یہ بات لکھی گئی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کے بعد ۸۰ فیصد یہودی قتل ہو جائیں گے۔اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو بچ جانے والے ۲۰ فیصد وہ ہوں گے جو حضرت مسیحؑ پر ایمان لے آئیں گے۔باقی ۸۰ فیصد اپنے اس کفر پر اَڑے رہیں گے اور قتل کر دیے جائیں گے۔اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

''قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ مسلمان یہود سے جنگ کریں گے اور انہیں قتل کریں گے۔حتیٰ کہ اگر کسی پتھر اور درخت کے پیچھے کوئی یہودی چھپا ہوگا تو وہ پتھر اور درخت پکار اٹھے گا کہ اے مسلمان! اے عبداللہ! میرے پیچھے یہ یہودی چھپا ہوا ہے' آ کر اسے قتل کرو۔سوائے ایک درخت غرقد کے' اس لیے کہ وہ یہودیوں کا درخت ہے''۔(صحیح مسلم و مسند احمد)

اور آج اسرائیل میں سب سے بڑی شجر کاری غرقد کی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ یہ مستند احادیث ان کے علم میں ہیں۔

خراسان کے بارے میں جان لیجیے کہ یہ افغانستان کا قلب ہے اور اس وقت ایران کا ایک صوبہ ''خراسان'' ہے' جس کا دارالحکومت ان کا مقدس شہر مشہد ہے۔لیکن احادیث میں جس ''خراسان'' کا تذکرہ آیا ہے وہ تاریخ میں ''خراسانِ بزرگ'' (عظیم تر خراسان) کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس میں پورا افغانستان' وسط ایشیائی ریاستیں' ایران

کا ایک حصہ اور پاکستان کا ایک حصہ‘ جو مالاکنڈ ڈویژن کہلاتا ہے‘ شامل ہے۔ اور یہ بڑی معنی خیز بات ہے کہ اسی مالاکنڈ سے وہ تحریک چلی ہے جو اصل تحریک طالبان ہے۔ بہرحال افغانستان پر حملے کا اصل سبب یہی ابلیسی سوچ تھی کہ ع ’’آشکارا ہو نہ جائے شرعِ پیغمبر کہیں!‘‘ لہٰذا "Nip the evil in the bud" کے مصداق اس کے خلاف جارحیت کا آغاز کر دیا گیا۔ افغانستان سے آخری صلیبی جنگ کا جو سلسلہ شروع ہو رہا ہے اس پر عابداللہ جان کی کتاب

"AFGHANISTAN: The Genesis of the Final Crusade"

بہت چشم کشا اور معلومات افزا ہے۔

عراق پر حملے میں اگرچہ بظاہر اصل محرک تیل پر قبضہ تھا‘ لیکن باطن میں یہ گریٹر اسرائیل کے قیام کی جانب پہلا قدم تھا۔ تیل میں اصل دلچسپی صرف امریکہ کو تھی۔ اس لیے کہ یورپ تو زیادہ ترکیسپین کے علاقہ کے تیل پر نگاہیں رکھتا ہے۔ دوسری طرف بظاہر یہاں کوئی مذہبی معاملہ بھی نہیں تھا‘ لیکن درپردہ اصل شے یہودی سازش تھی۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ خلیج کی پہلی جنگ میں عراق کی فوجی طاقت کا بھرکس نکال دینے کے بعد اتحادی فوجوں کے کمانڈر انچیف شوارزکرافٹ نے صاف کہا تھا:

"We have fought this war for the protection of Israel."

اور عراق پر جو دوسری بار حملہ کیا گیا جس میں صدام کی حکومت ختم ہوئی تو صدام کا مجسمہ گرنے کے بعد اسرائیل کے وزیراعظم شیرون (جو بدبخت ابھی تک کومے میں پڑا ہوا ہے) نے کہا تھا کہ عنقریب عراق پر ہماری حکومت ہوگی۔ اس خبیث نے یہ بھی کہا تھا کہ اس سے پہلے تو ہم عراق میں سے صرف دریائے فرات تک کا علاقہ مانگتے تھے‘ لیکن اب ہمارا عزم ہے کہ دجلہ تک جائیں گے۔ اس طرح دجلہ اور فرات کے درمیان کے پورے دوآبہ کا زرخیز ترین علاقہ ہمارے پاس آئے گا۔ اس سے آپ اندازہ کر لیجیے کہ یہ دونوں چیزیں دونوں جگہ موجود ہیں۔ افغانستان میں مذہب کا عنصر زیادہ ہے لہٰذا وہاں بہت بڑا اتحاد (coalition) وجود میں آ گیا۔ عراق میں اس طرح کا اتحاد وجود میں نہیں آ سکا اور وہاں امریکہ تنہا ہے۔ یورپ بھی ساتھ نہیں آیا۔ زیادہ سے زیادہ کوئی علامتی سا معاملہ

*

آسٹریلیا اور برطانیہ کا ہے یا پھر جو پرانی دولت مشترکہ چلی آ رہی ہے اس میں شاید کینیڈا کا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ رومن کیتھولک عیسائی اس درجے اسرائیل نواز نہیں ہیں۔

افغانستان میں کارروائی کے لیے جو پوری دنیا کے غیر مسلم ممالک کا اتحاد واشتراک ہو گیا' اس کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ یہاں سے انہیں اسلام کی حیاتِ نو (resurgence) کا اندیشہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث میں نے ابھی آپ کو سنائی ہے کہ ''خراسان سے سیاہ جھنڈے (اٹھائے لشکر) نکلیں گے' جنہیں کوئی شے نہیں روک سکے گی' یہاں تک کہ وہ جھنڈے ایلیا (بیت المقدس) میں جا کر نصب ہو جائیں گے''۔ آنحضور ﷺ کے زمانے میں بیت المقدس عیسائیوں کے قبضے میں تھا۔ اس کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ہمارے قبضے میں آیا۔ لیکن پھر صلیبیوں نے یہ ہم سے چھین لیا تھا اور یہ ۱۰۹۹ء تا ۱۱۸۷ء پورے ۸۸ برس تک عیسائیوں کے قبضے میں رہا۔ پھر یہ صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں عیسائیوں کے قبضے سے آزاد کرایا گیا۔ اب اس پر پھر یہود کا قبضہ ہے اور اسے ان سے واپس لینا ہے۔ پہلی مرتبہ بھی عرب اسے واپس نہیں لے سکے تھے' کھونے والے عرب ہی تھے۔ واپس لینے والا صلاح الدین ایوبی کرد تھا۔ اب بھی کھونے والے عرب ہیں۔ اسرائیل نے مصر' شام اور اردن تینوں کا مقابلہ کیا تھا اور پورے مغربی کنارے پر' گولان کی پہاڑیوں پر اور جزیرہ نمائے سینا پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب بھی عربوں میں تو کوئی دم نہیں ہے' ان میں کوئی جان نہیں ہے۔ ان کو عیاشیوں نے اور دولت کے نشے نے تباہ و برباد اور کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہود کے مقابلے کے لیے کسی اور قوم کو تیار کرنا ہے۔ واللہ اعلم!

پس چہ باید کرد؟

بہرحال جو باتیں میں نے آپ کو بتائیں' یہ تو سب شیاطین جن وانس کے منصوبے اور ان کے پروگرام ہیں۔ کبھی خمینی صاحب نے امریکہ کو ''شیطانِ بزرگ'' قرار دیا تھا۔ وہ آج بھی روئے ارضی پر سب سے بڑا شیطان ہے' جبکہ اس کے پیچھے یہود کا سازشی ذہن کارفرما ہے۔ بالفعل کیا ہو گا یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کی تدبیروں کو ناکام بنا سکتا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ (آل عمران: ٥٤) ''کافر

اپنی چالیں چلتے ہیں اور اللہ اپنی چال چلتا ہے۔'' اور ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴿۴۴﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ط اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ﴿۴۵﴾﴾(القلم) ''(اے نبیﷺ! آپ گھبرائیں نہیں) ہم عنقریب ان کافروں کو رفتہ رفتہ وہاں سے لے آئیں گے جہاں سے انہیں احساس تک نہیں ہوگا (کہ یہ تو گرفت میں آ رہے ہیں) اور ابھی ذرا میں انہیں ڈھیل دے رہا ہوں' یقیناً میری چال بہت مضبوط ہے''۔ ان شاء اللہ اسی علاقے یعنی پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے اور افغانستان سے احیاءِ خلافت کی تحریک اٹھے گی اور یہیں سے فوجیں جائیں گی جو عرب کے اندر حضرت مہدی کی حکومت کو مستحکم کریں گی۔ حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((يَخْرُجُ نَاسٌ مِنَ الْمَشْرِقِ فَيُوَطِّئُوْنَ لِلْمَهْدِيِّ يَعْنِيْ سُلْطَانَهُ))(۱)

''مشرق کی طرف (کے کسی ملک) سے فوجیں نکلیں گی جو مہدی کی حکومت قائم کریں گی''

بہر حال ہوگا کیا' یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے' ہمارے لیے اہم تر معاملہ یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ یہ ہے میری تقریر کا آخری حصہ۔ ذوالفقار مرزا اور سید قائم علی شاہ نے جو کہا ہے میں اس کی تائید کرتا ہوں کہ طالبانائزیشن اور ہے' اسلامائزیشن اور ہے۔ طالبانائزیشن کے اندر کچھ غیر تعلیم یافتہ اور جذباتی قسم کے لوگ بھی ہیں اور ان میں انتہا پسندی بھی ہے۔ افغانستان میں طالبان کے دور میں یہ چیزیں ضرور رہی ہیں۔ اگر انہیں کچھ اور وقت مل جاتا تو یہ ان چیزوں سے رفتہ رفتہ باہر نکل آتے۔ مگر انہیں موقع نہیں دیا گیا' انہیں ابتدا میں ہی ختم کر دیا گیا۔ بہر حال پہلی بات یہ ہے کہ اسلام اور پاکستان لازم و ملزوم ہیں۔ یہاں اسلام آئے گا تو یہ ملک رہے گا' بصورتِ دیگر ختم ہو جائے گا اور اس میں کوئی شک نہیں۔ اس موضوع پر میں نے دو کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں ''اسلام اور پاکستان''، لکھی کہ پاکستان کیسے وجود میں آیا اور ۱۹۸۵ء میں ''استحکامِ پاکستان'' کے نام سے کتاب لکھی۔ اگر اللہ توفیق دے تو انہیں ضرور پڑھیے۔ پاکستان کا کوئی جواز نہیں اگر یہاں اسلام نہ آئے۔ اور واقعتاً ہم جواز کھو چکے ہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ ہمیں مہلت دے رہا

(۱) سنن ابن ماجه' كتاب الفتن' باب خروج المهدی۔

*

ہے لیکن اب یہ سمجھ لیجیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ایک خاص مہلت ہے اور شاید آخری مہلت ہے جو ہمیں مل رہی ہے۔ یہاں اسلامائزیشن کا عمل نہ ہوا تو یہ ملک نہیں رہے گا۔ کوثر نیازی مرحوم کا ایک بڑا تلخ شعر ہے۔ موصوف ایک زمانے میں جماعت اسلامی کے بڑے مخلص کارکن تھے مگر بعد میں ان کی شخصیت کچھ متنازعہ اور بدنام ہوگئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا: ؎

اسلام کو گر تیری فضا راس نہ آئے
اے میرے وطن تجھ کو کوئی آگ لگائے!

ہمیں اسلام چاہیے اور اسلام نہیں آئے گا تو یہ ملک نہیں رہے گا۔ کوئی زرداری' کوئی نواز شریف اس ملک کی بقا کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اس کی بقا صرف اور صرف اسلامائزیشن میں ہے۔ ہم ۶۱ سال تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور اس کی پاداش میں ایک عذابِ ادنیٰ بھی ہم جھیل چکے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان دولخت ہوا۔ ہمارے ۹۳ ہزار پاکستانی مسلمان ٹرکوں میں بھر بھر کر بھارت کی قید میں بھیڑوں بکریوں کی طرح ہانک کر لے جائے گئے۔ ہمارے ٹائیگر نامی جرنیل نے سکھ جرنیل کو اپنا ریوالور پیش کیا۔ کتنے لوگ مارے گئے' کتنا فساد ہوا! مسلمان کے ہاتھوں مسلمانوں کا کتنا خون ہوا۔ یہ اللہ کا ایک خاص عذاب ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّـبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ﴾ (الانعام: ٦٥)

''(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اللہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ جب چاہے تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے نکال دے یا تمہیں گروہوں میں بانٹ دے اور پھر ایک دوسرے کی قوت کا ایک دوسرے کو مزا چکھائے''۔

اس آیت میں عذابِ الٰہی کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں۔ پہلی یہ کہ آسمان سے کوئی آفت نازل ہو جائے۔ دوسری یہ کہ زمین کے اندر سے کوئی مصیبت ظاہر ہو جائے۔ مثلاً زلزلہ آ جائے' جیسے کچھ عرصہ قبل آیا تھا' یا پھر زمین پھٹے اور انسان اندر دھنس جائیں۔ اور اللہ کے عذاب کی ایک تیسری شکل بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ آسمان کو کوئی تکلیف دے نہ زمین کو' بلکہ

تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور تم خود ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگو۔ ہم ۱۹۷۱ء میں اللہ کے اس عذاب کا مزا بھی چکھ چکے ہیں مگر ہماری حالت جوں کی توں ہے۔ اب ہم اس جگہ پر پہنچ گئے ہیں کہ خدانخواستہ ''عذابِ اکبر'' آنے والا ہے۔

میں نے آغازِ خطاب میں یہ آیت تلاوت کی تھی:

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۞﴾ (السجدۃ)

''ہم لازماً انہیں بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے عذاب کا مزا چکھائیں گے شاید کہ وہ لوٹ آئیں۔''

۱۹۷۱ء میں چھوٹا عذاب آیا لیکن بہرحال مغربی پاکستان برقرار رہا اور اسی کا نام پاکستان پڑا۔ اب اندیشہ ہے کہ کہیں بڑا عذاب آ جائے اور پاکستان کے حصے بخرے ہو جائیں' جس کے نقشے دنیا میں شائع کیے جا چکے ہیں۔ اب بھی اگر یہاں اسلام نہ آیا اور اس کے لیے پرامن اور تدریجی دستوری و قانونی راستہ اختیار نہ کیا گیا تو عسکریت پسندی بڑھے گی' رکے گی نہیں۔ ایک بہت بڑے مصری ادیب اور مؤرخ شکیب ارسلان لکھتے ہیں کہ سطح مرتفع پامیر سے جو پہاڑی سلسلے شروع ہوتے ہیں' ان میں سے دو یعنی کوہِ ہمالیہ اور کوہِ ہندوکش کے درمیان جو علاقہ ہے اس سے ایک تکون وجود میں آتی ہے جس کا قاعدہ (Base) کوہستانِ مالاکنڈ ہے۔ اسی تکون میں جو قوم آباد ہے اگر پوری اسلامی دنیا میں اسلام کی نبضیں ڈوب جائیں تب بھی یہاں کے لوگوں میں اسلام کی نبض چلتی رہے گی۔ اور یہ وہ علاقہ ہے جہاں سے پاکستان کے طالبان کا آغاز ہوا' جہاں سے نفاذِ شریعت کی پرامن تحریک چلی تھی جس کا راستہ روک دیا گیا تھا۔ اب وہ شدت پسندی کی طرف آ گئے ہیں۔ اب اگر انہیں تشدد سے روکا گیا اور امریکی ایجنڈے ہی کو پورا کرتے ہوئے اپنے ہی لوگوں کو مارتے رہے تو جواب میں یہ شدت پسندی اور بڑھے گی: ؎

گر اِک چراغِ حقیقت کو گل کیا تم نے
تو موجِ دُود سے صد آفتاب ابھریں گے!

اب یہ جو خودکش حملہ آور آ رہے ہیں یہ انہی لوگوں کے رشتہ دار ہیں جو امریکی بمباری میں

*

مارے گئے ہیں۔ کتنے تھے جن کے بیٹے بیٹیاں مارے گئے۔ ہمارے ہاں کمانڈوز کے ایک کیمپ پر جو حملہ ہوا تھا جس میں ہمارے بیس کے قریب بہترین کمانڈوز مارے گئے تھے تو وہ خود کش بمبار ان کمانڈوز میں سے ہی ایک تھا۔ باہر سے تو کوئی کمانڈو کیمپ کے اندر داخل نہیں ہوسکتا! اور کہا جاتا ہے کہ یہ وہی کمانڈو تھا جس کی بیٹی جامعہ حفصہ ؓ کے اندر جلائی جانے والی بچیوں میں شامل تھی۔ اس کے دل میں انتقام کا جو لاوا کھول رہا تھا اس نے خود اپنی جان دے کر اس کو ٹھنڈا کیا۔ ایسے ہی باجوڑ میں حملہ ہوا تھا تو جواباً ہمارے ملٹری کیمپ پر حملہ ہو گیا۔ یہ بھی جان لیجیے کہ یہ خطرہ انہی علاقوں تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ سلسلہ نیچے تک آئے گا اور افغانستان اور شمال سرحدی صوبے میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ اس کا ایک تسلسل ہوگا۔ اور یہ خطرہ حقیقی ہے' غیر حقیقی اور وہمی و خیالی نہیں ہے۔

تقریباً ساڑھے چار سال قبل میں انتہائی مایوسی کو پہنچ چکا تھا کہ پاکستان کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ میں نے ۲۹ فروری ۲۰۰۴ء کو اپنے خطاب میں کہا تھا کہ پاکستان اپنا جواز کھو چکا ہے۔ اس لیے کہ یہ اسلام کے نام پر بنا تھا مگر یہاں اسلام کا نظام نہیں لایا گیا۔ جو اسلام یہاں پر ہے وہ تو بھارت میں بھی ہے اور امریکہ میں بھی ہے۔ کہاں ہے اسلام کا سیاسی نظام' اسلام کا تعزیراتی نظام' اسلام کا فوجداری قانون' سول لاء اور اس کے عائلی قوانین؟ ایک خود ساختہ فیلڈ مارشل صدر ایوب خان نے جو عائلی قوانین بنائے تھے' ان کے بارے میں تمام مکاتبِ فکر کے علماء نے کہا کہ یہ غلط ہیں' لیکن اس مسئلہ پر کوئی تحریک نہیں اٹھائی۔ یہ ان کی غلطی اور کوتاہی تھی۔ جمہوریت کی تحریک میں تو شامل ہو گئے مگر اس پر کوئی تحریک نہیں چلائی۔ بہر حال میں نے کہا تھا کہ یہ ملک خداداد اسلام کے نام پر بنا تھا مگر اسلام کا نظام قائم نہیں کیا گیا لہٰذا یہ اپنا جواز کھو چکا ہے۔ لیکن پچھلے سال سے میری مایوسی میں کچھ کمی ہوئی ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کو اللہ تعالیٰ نے ہمت دی اور وہ ظلم و نا انصافی کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ جرنیلوں کے جمگھٹے میں ایک سویلین آدمی جس درجہ مرعوب ہوسکتا ہے' آپ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں' لیکن وہ شخص مرعوب نہیں ہوا۔ اور پھر وکلاء کی جو برجستہ (spontaneous) تحریک چلی ہے' یہ ایک انہونی شے ہے جو ہماری سوچ سے باہر تھی۔ یہ کوئی چھوکروں کی

چلائی ہوئی تحریک نہیں ہے' یہ ہمارے ہاں کے عام آدمیوں کی تحریک نہیں ہے' بلکہ یہ تو کالے کوٹ اور کالی ٹائیاں پہننے والے پڑھے لکھے لوگوں کی تحریک ہے۔انہوں نے سختیاں جھیلی ہیں اور یہ تحریک ابھی تک چل رہی ہے۔اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تیزی اور تندی میں کمی آئی ہے اور حکومت کو ان کے اندر رخنہ اندازی کا موقع ملا ہے' لیکن بہرحال ان دونوں چیزوں سے میری مایوسی میں قدرے کمی ہوئی ہے۔میری مایوسی میں کمی کا دوسرا سبب ۱۸ فروری کے الیکشن کا پرامن طور پر منعقد ہو جانا تھا۔ مجھے شدید اندیشہ تھا کہ اس موقع پر زبردست دھاندلی ہوگی۔اگر دھاندلی ہوتی تو پھر لازماً ایک زوردار تحریک چلتی' ملک میں بدامنی ہوتی تو پھر دونوں طرف جو گدھ بیٹھے ہوئے ہیں' یعنی مغرب میں نیٹو فورسز اور مشرق میں انڈین فورسز' یہ پاکستان میں داخل ہو کر اس کے ایٹمی دانت توڑ دیتے اور پھر پاکستان بھارت کے رحم و کرم پر ہوتا۔ میں کنڈولیزا رائس کے بیان کا ذکر کر چکا ہوں کہ پاکستان کے مستقبل کا فیصلہ امریکہ اور بھارت مل کر کریں گے۔ لیکن بہرحال الیکشن میں متوقع دھاندلی نہیں ہوئی اور یہ خطرات ٹل گئے۔

پاکستان میں اسلامائزیشن کا پرامن' تدریجی' دستوری اور قانونی طریقہ کیا ہے؟ وہ یہ کہ ۵۰۔۱۹۴۹ء میں جو عمل شروع ہوا تھا اور پھر اس کے بعد سے آج تک ختم ہے' اس کو از سرِ نو شروع کیا جائے۔ع ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!'' ۱۹۴۹ء میں قراردادِ مقاصد کے ذریعے گویا پاکستان میں نظامِ خلافت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔یعنی حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے اور ہمارے پاس جو بھی اختیار ہے یہ ایک مقدس امانت ہے' جو کتاب و سنت کے دائرے کے اندر استعمال ہوگا۔اپنی روح کے اعتبار سے قراردادِ مقاصد میں خلافت کا تصور موجود ہے۔اس سے پہلے قائداعظم محمد علی جناح کی ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کی وجہ سے جو ایک غلط فہمی پیدا کر دی گئی تھی کہ ''پاکستان میں دستور شریعت پر مبنی نہیں ہوگا'' تو انہوں نے ۱۹۴۸ء میں کراچی کی ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے اس کی تردید کر دی تھی اور فرمایا تھا کہ کچھ لوگ شرارت کے ساتھ یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔قائداعظم کے الفاظ ہیں کہ ایسے لوگ شریر اور فتنہ پرور ہیں!

اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں یہاں کے سیکولر عناصر نے بڑا شور مچایا کہ کس کا اسلام لاؤ

*

گے؟ شیعہ کا' سنی کا' دیوبندی کا' بریلوی کا یا وہابی کا؟ اس پر پاکستان کے تمام مذہبی مکاتب فکر کی چوٹی کی قیادت کراچی میں جمع ہوگئی ۔ اللہ ان بزرگوں کو غریق رحمت کرے۔ ان میں شیعہ بھی تھے' اہل حدیث بھی تھے' بریلوی بھی تھے' دیوبندی بھی تھے' جماعت اسلامی بھی تھی' خود مولانا مودودی تھے۔ان ۳۱ علماء کرام نے مل کر اسلامی دستور سازی کے لیے ۲۲ متفقہ اصول دے دیے کہ ان کی روشنی میں دستور سازی کی جائے۔اب تمام مکاتب فکر کے لوگ جمع ہو گئے تو کوئی عذر باقی نہ رہا۔لیکن بعد میں جو کچھ ہوا کہ ساری بساط ہی لپیٹ دی گئی تو یہ ایک بڑی درد بھری داستان ہے۔اس وقت میں اس کو نہیں چھیڑنا چاہتا کہ اس میں کس کا کیا کردار رہا ہے۔ اس میں کچھ کردار اپنوں نے ادا کیا اور کچھ بیرونی دباؤ کے تحت ہوا۔لیاقت علی خان کو قراردادِ مقاصد پاس کرانے کی سزا دی گئی۔ان کو ایسے قتل کیا گیا کہ قاتل کا آج تک سراغ نہیں ملا۔ یہ ایسے نہیں ہو گیا' اس کے پیچھے بڑے بڑے کردار ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ وہ عمل دوبارہ کیسے شروع ہو؟ صدر ضیاء الحق نے ''فیڈرل شریعت کورٹ'' کے نام سے جو ایک ادارہ قائم کیا تھا یہ اصولی اعتبار سے ایک بہترین قدم تھا کہ یہ شرعی عدالت ہے' اس میں کوئی شخص پٹیشن داخل کرا سکتا ہے کہ میں ثابت کرتا ہوں کہ پاکستان کا فلاں قانون کتاب وسنت کے منافی ہے' اسے ان کے مطابق بنایا جائے ۔عدالت ان قوانین کا جائزہ لے کہ یہ پورا قانون یا اس کی فلاں شق خلاف شریعت ہے یا نہیں! اس پر بحث مباحثہ ہو' دونوں طرف سے دلائل لائے جائیں' علماء بھی آئیں' وکلاء بھی آئیں اور بحث کریں۔ بالآخر اگر عدالت فیصلہ دے دے کہ فلاں قانون جو بننے جا رہا ہے یہ پورا خلافِ شریعت ہے یا اس کی فلاں شق شریعت کے خلاف ہے تو اسے منسوخ کر دیا جائے گا اور عدالت ایک مہلت دے گی کہ اگر یہ مرکزی معاملہ ہے تو مرکزی حکومت اور صوبائی معاملہ ہے تو صوبائی حکومت اتنی مدت کے اندر اندر اس کا متبادل لے آئے۔ جیسے ہی مہلت ختم ہوگی یہ قانون کالعدم ہو جائے گا۔ اصولی اعتبار سے اس سے زیادہ صحیح سکیم کوئی نہیں سوچ سکتا۔ آج بھی میں اس کا قائل ہوں۔لیکن یہ بدبختی تھی ضیاء الحق کی کہ اس نے اس کو بالکل غیر مؤثر کر دیا۔اپنی ہی بنائی ہوئی فیڈرل شریعت کورٹ

کے ہاتھوں میں دو ہتھکڑیاں ڈال دیں اور پاؤں میں دو بیڑیاں پہنا دیں کہ پاکستان کا دستور اس کے دائرۂ اختیار سے خارج ہے۔ اسی طرح جوڈیشیل پروسیجرل لاز یعنی ضابطۂ دیوانی‘ ضابطۂ فوجداری‘ یہ بھی اس کے دائرے سے خارج ہیں۔ مالی معاملات بھی دس سال تک خارج ہیں اور فیملی لاز تو مستقل خارج ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اب کرنے کا کام یہ ہے کہ پہلے نمبر پر فیڈرل شریعت کورٹ کے دائرۂ اختیار پر جو تحدیدات (limitations) ہیں وہ ختم کی جائیں۔ دوسرے یہ کہ اس کا سٹیٹس کم سے کم ہائی کورٹ کے درجے کا ہونا چاہیے۔ تیسرے یہ کہ اس میں تمام مسالک کے جید علماء کو لا کر بٹھایا جائے۔ ان میں جدید قانون کے جاننے والے وکلاء بھی ہوں اور اسلامی شریعت کے ماہر علماء بھی ہوں۔ اس عدالت کے فیصلوں پر نظر ثانی کا کھلا موقع ہونا چاہیے۔ کسی شہری کی طرف سے کسی قانون کے خلاف پٹیشن آنے پر یا ازخود نوٹس لے کر یہ عدالت جائزہ لے اور اس طرح ایک ایک کر کے تمام غلط قوانین ختم کیے جائیں اور ان کی جگہ پر پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلی نئے قانون لے کر آئے۔ عدالت کا کام قانون سازی (legislation) نہیں ہے۔ وہ صرف یہ فیصلہ دے سکتی ہے کہ فلاں قانون شریعت سے تجاوز کر گیا ہے یا اس کی فلاں شق شریعت کے خلاف ہے۔ قانون سازی نیشنل اسمبلی یا صوبائی اسمبلی ہی کرے گی۔ پھر یہ کہ اس عرصے کے دوران اسلامی نظریاتی کونسل پر جو ارب ہا ارب روپیہ خرچ ہوا ہے اور اس کی رپورٹوں کے انبار لگ گئے ہیں‘ لیکن کسی ایک سفارش کو بھی آج تک پارلیمنٹ میں پیش نہیں کیا گیا‘ حالانکہ اس کونسل میں تمام مکاتبِ فکر کے جید علماء موجود رہے ہیں‘ تو ان رپورٹوں کو رفتہ رفتہ پارلیمنٹ کے سامنے لایا جائے اور ان کی روشنی میں نئی قانون سازی کی جائے۔

اگر یہ قانونی‘ دستوری راستہ کھول دیا جائے اور تدریجاً اس طریقے سے اسلامائزیشن آف لاز آف پاکستان کا عمل شروع ہو جائے تو پھر شدت پسندی کا خطرہ نہیں رہے گا۔ یہ جو کہا جا رہا ہے کہ دہشت گردی ہو رہی ہے‘ طالبان آ رہے ہیں‘ ان سے ڈرو اور بچو اور مقابلے کی تیاری کرو‘ تو اس سے تو فساد ہو گا اور فساد کا نتیجہ جو نکلے گا‘ وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اگر یہ پراسیس شروع ہو جائے تو یہ تمام معاملہ ختم ہو جائے گا جس کا

*

خطرہ ظاہر کیا جا رہا ہے۔ جنرل حمید گل نے بھی یہی کہا تھا کہ اگر ایسا ہو جائے تو یہ soft revolution ہوگا' بغیر تشدد کے معاملہ حل ہو جائے گا۔ بہر حال اگر نیت ٹھیک ہو اور جیسے قائم علی شاہ نے اور ذوالفقار مرزا نے سمجھ لیا ہے اسی طرح دیگر برسرِ اقتدار لوگ بھی سمجھ لیں تو ظاہر ہے کہ پھر کسی توڑ پھوڑ' بدامنی اور کسی تشدد کے بغیر یہاں اسلامائزیشن ہو جائے گی۔ اس سے سب کے دل خوش ہو جائیں گے اور اس سارے تشدد اور دہشت گردی کے راستے بند ہو جائیں گے۔ بصورتِ دیگر یہی غیر تعلیم یافتہ یا نیم تعلیم یافتہ لوگ آگے آئیں گے جن کا نہ تو اسلام کے بارے میں تصور مکمل ہے اور نہ انہیں دنیا کے حالات کا علم ہے۔ ان کی شریعت کے اصل مصادر' منابع اور ذرائع تک رسائی نہیں ہے۔ انہیں یہ تو معلوم ہے کہ داڑھی رکھنا سنت ہے' لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ یہ فرض نہیں ہے اور اس کی خاص مقدار بھی معین نہیں ہے۔ یہاں آڈیوز اور ویڈیوز کا کلچر ہے جس میں انہیں معلوم ہے کہ عریانیت ہے۔ لہٰذا وہ ویڈیو سنٹروں کو نشانہ بناتے ہیں۔ اسی طرح یہاں لڑکیوں کو مخلوط تعلیم بھی دی جا رہی ہے اور ڈانس اور موسیقی کی تعلیم بھی نافذ کی جا رہی ہے' بلکہ تعلیم کا شعبہ ہی اسماعیلیوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے' لہٰذا ان چیزوں کے خلاف ان کی طرف سے ردِّعمل ظاہر ہو رہا ہے۔ تو اس چیز کا راستہ اگر روکنا ہے تو وہ عمل شروع کرنا پڑے گا جو میں نے بیان کر دیا ہے۔ میاں نواز شریف جب وزیر اعظم تھے تو وہ اپنے والد محترم اور بھائیوں کے ہمراہ دو مرتبہ میرے پاس آئے تھے اور میں نے انہیں یہ ترمیمی بل مرتب کر کے دیا تھا جس کے نکات میں نے ابھی بیان کیے ہیں' لیکن ان کی بدقسمتی کہ وہ اپنے دورِ اقتدار میں کچھ بھی نہ کر سکے۔

اس وقت پاکستان کے دینی مدرسوں میں شدید تحریک چل رہی ہے' جس کے لیے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا معاملہ ایک علامت (symbol) بن چکا ہے۔ دینی مدارس کے طلبہ بہت بڑی تعداد میں عسکریت پسندی کی طرف آ رہے ہیں اور طالبان کی سورس یہی لوگ ہیں۔ انہی سے افغانستان میں طالبان اُبھرے تھے اور انہی سے پاکستان کے ابھر رہے ہیں۔ ان کے اندر ردِّعمل کی شدید لہر ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی بہت بڑا فساد ہو گیا تو اس کا نتیجہ پھر پاکستان کا اختتام ہوگا۔ لہٰذا اس سے بچنا ہے تو وہ راستہ اختیار کرنا ہوگا جو میں

نے ابھی بیان کیا ہے اور سالہا سال سے بیان کرر ہا ہوں۔ میں نے دستور کا ترمیمی بل بھی بنا کر دیا ہے اور اسے عام بھی کیا ہے۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہے۔ ہمارا پروگرام کسی عسکریت پسندی کی طرف جانے کا نہیں ہے۔ ہم اسے مفید نہیں سمجھتے' بلکہ مضر سمجھتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایک سہ نکاتی پروگرام ہے۔

(۱) بڑے پیمانے پر قرآن کے ذریعہ دعوتِ ایمان۔ بقول اقبال ؏ ''میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!'' گزشتہ پچاس سال سے میری سرگزشت یہی ہے کہ الحمدللہ قرآن مجید کا پڑھنا' پڑھانا' سیکھنا' سکھانا اور عام کرنا' یہی میرا کام رہا ہے۔ اور میں نے اللہ کے فضل سے ایک بڑی ٹیم تیار کر لی ہے جو یہ کام کر رہی ہے۔

(۲) دعوت کے بعد دوسرے نمبر پر جو چیز آتی ہے وہ ہے شریعت پر عمل' جو ایمان کا ایک ثبوت ہے۔ شریعت کے جس جس حکم پر عمل ہوسکتا ہے وہ تو کیا جائے۔ اگر نہیں کریں گے تو مجرم ہوں گے۔ البتہ شریعت کا ایک حصہ وہ ہے جس پر عمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ نظام نہ بدلا جائے۔ ہم چور کا ہاتھ نہیں کاٹ سکتے' اس لیے کہ نظامِ شریعت قائم نہیں ہے۔ البتہ دین اور شریعت کے جتنے حصہ پر عمل ہوسکتا ہے وہ تو کریں۔ پھر یہ کہ ایسے لوگوں کو منظّم کیا جائے۔ اس کے لیے بیعت کا نظام اپنایا جائے جو منصوص' مسنون اور ماثور ہے۔ ایک امیر کے ہاتھ پر بیعت ہو۔ وہ آگے بڑھنے کا حکم دے تو آگے بڑھو اور وہ رکنے کا حکم دے تو رک جاؤ۔

(۳) ایسے لوگوں کا تزکیہ اور تربیت۔ تزکیہ یہ کہ کوئی امنگ' کوئی ولولہ' کوئی مقصد' کوئی تمنا دل میں نہ رہے سوائے اللہ کی رضا کے۔ حکومت و اقتدار مطلوب نہ ہو' مال و دولت مطلوب نہ ہو' صرف اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح مقصود ہو۔ حضرت مجذوبؒ کا شعر ہے: ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی

یعنی اے اللہ! اب تو تُو میرے دل میں آ جا' میرے دل سے دوسری ہر تمنا نکل چکی ہے۔ اور تربیت اس چیز کی کہ اب تیار ہو جاؤ کہ تن من دھن سب کچھ اللہ کی راہ میں لگا دیں

*

گے۔ جب موقع آئے گا تو جان بھی دے دیں گے۔ لیکن اس کے لیے ملک گیر جماعت اور معتد بہ تعداد کا ہونا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ سو پچاس آدمی لے کر کسی لال مسجد کو مرکز بنا کر بیٹھ جائیں اور نعرہ لگا دیں۔ نہیں، بلکہ ملک گیر جماعت ہو اور وہ بھی معتد بہ تعداد میں ہو۔ وہ جب تک نہیں ہوتی تو ہم یہی تین کام کرتے رہیں گے، یعنی دعوتِ ایمان بذریعہ قرآن، تنظیم بذریعہ مسنون بیعت اور تزکیہ اور تربیت۔ جیسے اقبال نے کہا: ع

بانشۂ درویشی در ساز و دما دم زن!

یہی کام کرتے رہو۔ نہ عسکریت پسندی، نہ انتخابات۔ لیکن جب تعداد کافی ہو جائے تو منظّم اور پرامن، مطالباتی و احتجاجی تحریک اٹھے جس میں توڑ پھوڑ نہ ہو، گھیراؤ جلاؤ نہ ہو۔ جیسے گاندھی نے ''نمک بناؤ تحریک'' شروع کی تھی۔ کسی نے کوئی توڑ پھوڑ نہیں کی تھی۔ ان کے اپنے سر ضرور پھٹے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے بڑے بڑے لیڈروں کے سر پھٹے تھے۔ ہزار ہا لوگ جیلوں میں گئے۔ انہوں نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ اسی کا نقشہ ایرانیوں نے دکھایا۔ بیس ہزار سے لے کر تیس ہزار تک جانیں دے دیں۔ ہتھیار نہیں اٹھائے۔ اس لیے کہ اگر ہتھیار استعمال کرو گے تو اوپر جو حکومتیں ہیں ان کے پاس تو بے تحاشا فوج ہے۔ ان کے پاس ٹینک ہیں، ان کے پاس ہوائی جہاز ہیں، گن شپ ہیلی کاپٹرز ہیں، ان کے پاس کیا نہیں ہے۔ بس پرامن، منظّم، مطالباتی اور احتجاجی تحریک اٹھے۔ اللہ کرے کہ ہمیں اس کے لیے جو مہلت درکار ہے وہ مل جائے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ کہیں وہ مہلت ختم ہی نہ ہو گئی ہو۔ لیکن اگر ہم آخری سانس تک اس کام میں لگے رہیں گے تو اِن شاء اللہ، اللہ تعالیٰ ہم سے درگزر فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہم معذور قرار پائیں گے کہ اے اللہ! جو کچھ ہم کر سکتے تھے، آخری دم تک کرتے رہے، اگر ہم یہ کر سکے تو اپنی تو کامیابی ہے، باقی ملک کا کیا ہوتا ہے یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات٥٥

*

منبر و محراب

حکمتِ دین کا ایک عظیم خزانہ (۲)

جامع القرآن‘ قرآن اکیڈمی لاہور میں

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کے ۱۳ جولائی و ۲۰ جولائی ۲۰۰۷ء کے خطاباتِ جمعہ

گزشتہ سال محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ نے قرآن اکیڈمی لاہور میں اپنے خطاباتِ جمعہ میں ’’اربعین نوویؒ‘‘ کی احادیث کے سلسلہ وار مطالعہ کا آغاز فرمایا تھا۔ یہ خطابات جنوری ۲۰۰۸ء سے ترتیب وتسوید کے بعد میثاق میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ زیر نظر طویل حدیث کا مطالعہ تین خطاباتِ جمعہ میں مکمل ہوا تھا۔ ان میں سے پہلا خطاب گزشتہ شمارے میں شائع ہو چکا ہے‘ جس میں اس حدیث کے زیادہ تر حصے کا ترجمہ اور کچھ ضروری اشارات زیر بحث آئے تھے۔ اس شمارے میں اس سلسلے کے اگلے دو خطابات مکررات کو حذف کر کے یکجا شائع کیے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ —— بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ۝ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا هَلۡ اَدُلُّكُمۡ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنۡجِیۡكُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۝ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُجَاهِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ ؕ ذٰلِكُمۡ خَیۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝﴾ (الصّف)

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ ۝﴾ (الصّف)

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹)

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾ (التوبۃ)

ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا:

گزشتہ نشست میں ہم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث کا مطالعہ شروع کیا تھا۔ بعض اعتبارات سے اس حدیث کا جو اہم ترین حصہ ہے' یعنی جہاد فی سبیل اللہ' اس پر ہماری گفتگو کا صرف آغاز ہوا تھا۔ آج ہمیں اِن شاء اللہ العزیز اس گفتگو کی تکمیل کرنی ہے۔ پہلے ہم حدیث کے آخری حصے کا ترجمہ مکمل کرتے ہیں۔

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ مَا شَحَبَ وَجْهٌ وَلَا اغْبَرَّتْ قَدَمٌ فِیْ عَمَلٍ تُبْتَغٰى فِيْهِ دَرَجَاتُ الْجَنَّةِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ الْمَفْرُوْضَةِ كَجِهَادٍ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) ''اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! کوئی چہرہ (عمل کرتے کرتے) متغیر نہیں ہوا (اور تکان کی وجہ سے نڈھال نہیں ہوا) اور کوئی قدم (سفر کرتے کرتے) غبار آلود نہیں ہوا' کسی ایسے عمل میں جس کا مقصد درجاتِ جنت ہوں فرض نماز کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کے برابر''۔ فرض نماز سب سے اونچا عمل ہے اور اس کے بعد جہاد فی سبیل اللہ چوٹی کا عمل ہے۔ ہمارے دین میں مختلف عبادات و اعمال کے اندر جو اصل نسبت و تناسب ہے وہ ہمیں پیش نظر رکھنا چاہیے کہ فرائض کا کیا درجہ ہے' جہاد فی سبیل اللہ کا کیا مقام ہے' دین کی دعوت و تبلیغ' درس و تدریس اور تعلّم و تعلیم قرآن کا کیا درجہ ہے اور تہجد و دیگر نفل نمازیں ادا کرنا اور رات کا زیادہ تر حصہ اللہ کی عبادت اور ذکر و اذکار میں گزارنا' اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔

((وَلَا ثَقَّلَ مِيْزَانَ عَبْدٍ كَدَابَّةٍ تُنْفَقُ لَهٗ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ يُحْمَلُ عَلَيْهَا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) ''اور نہ بندہ کے میزانِ عمل میں کوئی نیکی اتنی وزن دار ثابت ہوئی جتنا کہ اس کا وہ جانور جو جہاد فی سبیل اللہ میں مر گیا یا جس پر اُس نے راہِ خدا میں سواری کی''۔

*

2

جنگوں کے دوران تیر وغیرہ صرف انسانوں کو ہی نہیں لگتے تھے بلکہ حیوانوں کو بھی لگتے تھے اور وہ بھی زخمی یا ہلاک ہوتے تھے۔ تو فرمایا جا رہا ہے کہ مجاہد فی سبیل اللہ جنگ کے دوران جو جانور استعمال کر رہا ہوتا ہے' اس کا ثواب بھی اللہ کے ہاں اُس مجاہد کے اعمال نامے اور میزانِ عمل کو بہت وزنی بنا دیتا ہے۔ آج کل تو خیر جنگوں میں گھوڑوں اور تیروں کا استعمال کم ہی ہوتا ہے اور ان کی جگہ جدید اسلحہ نے لے لی ہے۔

اب آیئے اس حدیث مبارکہ کے اہم ترین موضوع ''جہاد فی سبیل اللہ'' کی طرف جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے ہیں: ((وَاَنَّ ذِرْوَۃَ السَّنَامِ مِنْہُ الْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)) ''اور یقیناً دین کے اونچے اونچے عملوں میں سب سے چوٹی کا عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے''۔ یہ وہ بات ہے جو ہمارے ذہنوں سے بالکل اوجھل ہو گئی ہے۔ ایک تو اس لیے بھی کہ رسول اللہ ﷺ نے جو اسلام کے پانچ ارکان بتائے ہیں ان میں ''جہاد'' کا ذکر ہی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ: شَھَادَۃِ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ، وَاِقَامِ الصَّلَاۃِ، وَاِیْتَاءِ الزَّکَاۃِ، وَحَجِّ الْبَیْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ))

(متفق علیہ)

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں' اور نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔''

تو ہم نے اس حدیث مبارکہ پر اکتفا کر لیا' جبکہ اس میں جہاد کا ذکر ہی نہیں۔ پھر یہ کہ جہاد کو قتال کے معنی میں لے کر ہم نے اسے ایک تو بہت زیادہ محدود کر دیا ہے اور دوسرے اس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں۔ اور یہ غلط فہمیاں صرف دشمنوں کی پیدا کی ہوئی اور پھیلائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ اپنوں نے بھی پیدا کی ہیں جو زیادہ بنیادی ہیں اور انہی کی بنا پر دشمنوں کو جہاد کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا موقع حاصل ہوا ہے۔(۱)

(۱) ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے موضوع پر میرا ایک مفصل خطاب کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کا مطالعہ کیجیے اور اسے عام کیجیے' ان شاء اللہ کافی حد تک غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

درحقیقت جہاد فی نفسہٖ ایک طویل عمل ہے اور اس کو میں ایک سہ منزلہ عمارت سے تعبیر کرتا ہوں‘ جس کی ہر منزل کے مزید تین حصے ہیں۔ اس تعبیر کے حوالے سے گویا تین بڑے بڑے جہاد ہیں‘ اور ہر ایک کے تین مرحلے ہیں۔ پہلا جہاد ہے اللہ کے دین کو اپنے اوپر نافذ کرنا۔ اس کے لیے سب سے پہلے اپنے نفس امارہ کے خلاف جہاد کرنا ہوگا۔ ہمارے دین میں اسے ’’افضل الجہاد‘‘ کہا گیا ہے۔ رسول اللہﷺ سے پوچھا گیا: اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ ’’اے اللہ کے رسولﷺ! سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟‘‘ تو آپؐ نے فرمایا: ((اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَکَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ)) ’’کہ تم اللہ کی فرماں برداری میں اپنے نفس کے خلاف جہاد کرو‘‘۔ یعنی اسے اللہ کا مطیع بناؤ۔ دوسرے یہ کہ شیطانِ لعین اور اس کے چیلے چانٹوں کے خلاف جہاد کرنا۔ اس کے چیلے چانٹے جنات میں سے بھی ہیں جو غیر مرئی (invisible) ہیں‘ نظر نہیں آتے اور انسانوں میں سے بھی ہیں جو شیطان کے بھی کان کترتے ہیں۔ تیسرے نمبر پر ہے بگڑے ہوئے معاشرے کے خلاف جہاد۔ یہ بگڑا ہوا معاشرہ آپ کو برائی کی طرف دھکیلتا ہے۔ اس معاشرے کے دباؤ کو جھیلتے ہوئے اس کے خلاف جنگ کرو۔ خود اس کی رو میں نہ بہہ جاؤ بلکہ اس کا رُخ موڑ دو۔ ان تینوں عناصر کے خلاف جہاد کریں گے تب ہی اللہ کے دین کو اپنے اوپر نافذ کر سکیں گے اور اپنے آپ کو اللہ کا بندہ بنا سکیں گے۔

دوسرا بڑا جہاد ہے اللہ کے دین کی دعوت و تبلیغ۔ اس کے لیے جان و مال کھپے گا اور وقت لگے گا۔ سب سے پہلے دین کو خود سمجھیں گے تب ہی دوسروں کو سمجھا سکیں گے۔ یہ ایک طویل المیعاد مرحلہ (long life process) ہے۔ اس کی بھی پھر آگے تین سطحیں ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط﴾ (النحل: ۱۲۵) ’’(اے نبیؐ!) بلائیے اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ‘ اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان کے ساتھ مجادلہ کیجیے بھلے طریقے سے‘‘۔ ایک ہے سوسائٹی کی بلند ترین سطح یعنی معاشرے کے فہیم عناصر (intellectuals) کو دعوت و تبلیغ۔ اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ یہاں صرف وعظ و نصیحت سے کام نہیں چل سکتا‘ بلکہ دلیل و برہان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے قرآن اپنے

*

مخالفین سے دلیل طلب کرتا ہے کہ: ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (البقرۃ) ’’(اے نبیؐ!) ان سے کہہ دیجیے کہ اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو‘‘۔ تو ایسے ہی دوسروں کو بھی حق ہے کہ آپ سے یہی مطالبہ کریں۔ تو اس کے لیے تو ضروری ہے کہ انسان دین کی حکمت اور اس کے فلسفے کی گہرائیوں میں اُتر چکا ہو اور جدید زمانے کے جو غلط نظریات ہیں ان کی تہہ میں اتر کر انہیں سمجھ چکا ہو‘ اس کے بغیر تو یہ کام ممکن نہیں۔ دعوت وتبلیغ کی دوسری سطح ہے عوام الناس۔ یہاں محض اچھی وعظ ونصیحت کام کر جائے گی۔ آپ ان سے خلوص کے ساتھ بات کریں گے تو یہ مان جائیں گے۔ چونکہ عام لوگوں کے ذہن صاف تختی کی مانند ہوتے ہیں لہٰذا آپ جو چاہیں لکھ دیں۔ ان کے دماغوں میں خناس نہیں ہوتا‘ غلط فلسفے نہیں بھرے ہوتے۔ یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ:ع ’’از دل خیزد بر دل ریزد‘‘۔ البتہ یہ کہ آپ کا عمل آپ کی دعوت وتبلیغ کی شہادت دے رہا ہو۔ مخاطب یہ سمجھ رہا ہو کہ یہ شخص مجھ سے جو بات کہہ رہا ہے اُس پر خود بھی عمل کر رہا ہے۔

تیسری سطح پر وہ لوگ آتے ہیں جو خود تو گمراہ ہیں ہی‘ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرنے کے لیے انہیں باقاعدہ تنخواہیں ملتی ہیں‘ چاہے وہ قادیانی مبلغ ہوں‘ عیسائی مبلغ ہوں‘ بابی ہوں‘ چاہے کوئی اور ہوں۔ ان سے مناظرہ کرنا ہوگا اور اس کے لیے بہت ماہر ہونا پڑے گا۔ اس کی ایک تازہ مثال شیخ احمد دیدات مرحوم ہیں اور زندہ مثال ڈاکٹر ذاکر نائیک ہیں۔ اور ایک زمانے میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ تھے جنہوں نے پادری فنڈر کو شکست دی تھی جو پھر دم دبا کر بھاگا تھا‘ ورنہ شاید پورے ہندوستان کے مسلمان عیسائی ہو جاتے۔ اس لیے کہ اس نے کلکتہ سے دہلی تک ہر بڑے شہر میں علماء سے مناظرہ کیا اور انہیں ہر جگہ شکست دی۔ پھر دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اس نے کھلا چیلنج کیا کہ مسلمانو! میں کلکتہ سے چل کر یہاں آیا ہوں اور میں نے ہر شہر میں تمہارے مولویوں اور علماء کو شکست دی ہے اور اب میں پورے مسلم انڈیا کو کھلا چیلنج کر رہا ہوں۔ اس موقع پر اگر مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ میدان میں آ کر اُس کو نہ ہراتے تو منظر نامہ بدل سکتا تھا۔ اب یہاں دیکھئے کہ علماء نے شکستیں کیوں کھائیں؟ اس لیے کہ انہوں نے کبھی بائبل پڑھی ہی نہیں تھی۔ اور بائبل پڑھنا تو دور کی بات ہے‘ قرآن

مجید بھی صحیح طرح سے نہیں پڑھا تھا۔ اس لیے کہ ان کے ہاں تو فقہ چلتی تھی۔ انہوں نے صرف فتویٰ دینا ہوتا تھا اور فتویٰ دینے کے لیے فقہ کا علم کافی ہوتا ہے‘ جبکہ فقہ کا زیادہ مواد حدیث سے ہوتا ہے‘ قرآن سے تو کم ہے۔ لہٰذا قرآن کے ساتھ ان کا اشتغال اتنا نہیں تھا جتنا کہ ہونا چاہیے۔ جبکہ عیسائی مبلغین تو بہت سے علوم پڑھ کر اور سمجھ کر آتے تھے اور عربی و فارسی کے ماہر ہوتے تھے۔

تیسرا بڑا جہاد ہے اقامتِ دین کی جدوجہد۔ اس میں پہلا مرحلہ ہے دعوت دیتے رہنا۔ یعنی بس تبلیغ کرتے رہو۔ تمہیں کوئی مارے تو سہہ لو اور جوابی کارروائی نہ کرو۔ بارہ برس تک مکہ مکرمہ میں یہی حکم تھا کہ ﴿كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾ ’’اپنے ہاتھ بندھے رکھو!‘‘ جدید اصطلاح میں اسے کہیں گے Passive Resistance (صبر محض)۔ دوسرا مرحلہ یا دوسرا جہاد ہے Active Resistance (اقدام)۔ یعنی اب پورے نظام کو چیلنج کرو۔ اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ میدانِ جنگ کے اندر آ جاؤ‘ یہ قتال فی سبیل اللہ ہے‘ جو جہاد کی نویں اور بلند ترین منزل ہے۔ تو جہاد و قتال کے درمیان فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

اب دیکھئے جہاد و قتال کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد ہے اللہ کے دین کو غالب کرنا‘ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنا۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (الصف:۹) ’’وہی ہے (اللہ تعالیٰ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو ’الہدیٰ‘ اور ’دین حق‘ دے کر تا کہ اسے تمام کے تمام دین پر غالب کر دے‘‘۔ اس نظام کے نیچے چاہے کوئی یہودی رہے‘ کوئی عیسائی رہے‘ کوئی ہندو رہے اور چاہے کوئی مجوسی رہے‘ لیکن نظام اللہ کا ہوگا اور ان کو چھوٹا ہو کر رہنا ہوگا۔ سورۃ الصّف کی دو آیات ملاحظہ کیجیے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱﴾

’’اے اہل ایمان! کیا میں تمہیں بتاؤں وہ تجارت (وہ کاروبار) جو تمہیں دردناک عذاب (یعنی جہنم) سے چھٹکارا دلا دے؟ ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اس

*

کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو"۔

اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ جہاد کے بغیر جہنم سے چھٹکارا پانے کا خیال ایک امیدِ موہوم ہے، یہ محض ایک بے بنیاد تمنا (wishful thinking) ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ جہاد کے بغیر تو نجات ہے ہی نہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ نفس کے خلاف تو چوبیس گھنٹے جہاد کرنا پڑتا ہے۔ بندۂ مؤمن کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ جہاد نہ ہو رہا ہو۔ مثلاً ایک شخص نے عین فجر کے وقت اذان کی آواز سن لی، آنکھ بھی کھل گئی، لیکن نفس نے کہا ذرا سو جاؤ۔ پس اس نے کروٹ لی، نیند آئی اور نماز چھوٹ گئی، جبکہ ایک بندۂ مؤمن ایسے موقع پر اپنے نفس کے خلاف ڈٹ جاتا ہے، جہاد کرتا ہے اور اٹھ کر باجماعت نماز ادا کر لیتا ہے، اور خاص طور پر شدید سردی کے موسم میں جبکہ وضو کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ پس ایک بندۂ مؤمن برابر جہاد کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے بغیر تو نجات ہی نہیں۔

بہرحال دین کی چوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کی چوٹی قتال فی سبیل اللہ ہے۔ اسی سورۃ الصّف کی آیت ۴ میں فرمادیا گیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ۝۴﴾

"یقیناً اللہ کو محبوب تو وہ بندے ہیں جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔

یعنی یکجا ہو کر، صفیں باندھ کر اور دلیری کے ساتھ میدانِ جنگ میں اترتے ہیں تاکہ دشمن ان کی صفوں میں کوئی رخنہ نہ ڈال سکے۔ اس طریقے سے اللہ کی راہ میں جنگ کرنا قتال فی سبیل اللہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں جب یہ مرحلہ شروع ہو گیا تو فرمایا گیا کہ دیکھنا کہیں درمیان میں نہ رک جانا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا سانس پھول جائے اور تمہاری ہمتیں جواب دے جائیں، بلکہ فرمایا گیا: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (الانفال: ۳۹) "اور ان کے خلاف جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ وفساد بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ کا ہو جائے"۔ سب سے

بڑا فتنہ وفساد یہ ہے کہ انسان (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے‘ خود حاکم بن کر بیٹھ جائے۔ آج کے دَور کا سیکولرزم اور عوامی حاکمیت (popular sovereignty) کا تصور سب سے بڑی بغاوت اور سب سے بڑا شرک ہے۔ ہمارے ہاں اپنے آپ کو بڑے بڑے موحدین کہلوانے والے یہ نہیں جانتے کہ آج کے دَور کا اصل شرک کیا ہے۔ آج بت پرستی کا شرک تقریباً معدوم ہو چکا ہے۔ ہندوؤں میں بھی نچلے درجے کے لوگ ہیں جو مندروں میں جا کر گھٹنے ٹیکتے ہیں اور بتوں کی ڈنڈوت کرتے ہیں۔ پڑھے لکھے ہندوؤں میں سے کوئی ایسا نہیں کرتا۔ آج کل عیسائیوں میں سے بھی بہت کم ہیں جو چرچ میں جاتے ہوں گے۔ امریکہ میں تو پھر بھی کچھ ہیں‘ یورپ وغیرہ میں تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بہرحال آج کے دَور کے اصل شرک کو پہچاننا بہت ضروری ہے۔

قتال فی سبیل اللہ‘ جہاد فی سبیل اللہ کی آخری منزل اور چوٹی ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ دین کل کا کل اللہ کا ہو جائے‘ سارا نظام اللہ کے تابع ہو جائے‘ چاہے وہ سیاسی نظام ہو‘ معاشی نظام ہو‘ معاشرتی نظام ہو اور چاہے وہ دیوانی قانون ہو‘ فوجداری قانون ہو اور عائلی قوانین ہوں۔ ہر شے اللہ کے دین کے تابع ہو جائے۔ اور یہ قتال جاری رہے گا جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو جائے۔

حدیث زیرِ درس کا جو دوسرا اہم موضوع ہے اور قرآن مجید میں بھی جس کا حکم ہے کہ اب مشرکین عرب کا قتل عام کر دیا جائے‘ اس کے بارے میں جان لیجیے کہ یہ اس قتال فی سبیل اللہ کی آخری شکل ہے‘ جس کو جدید جنگی اصطلاح میں کہا جاتا ہے: ”Mopping up operation“۔ یعنی بحیثیت مجموعی فتح حاصل ہو جانے کے بعد اب چھان بین کی جائے کہ ابھی کوئی مزاحمت باقی تو نہیں ہے۔ اور یہ آپریشن جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں‘ خاص اُمیین عرب یعنی مشرکین عرب کے لیے تھا‘ کسی اور کے لیے نہیں تھا۔ اور اُن کے لیے صرف دو متبادل راستے تھے کہ یا تو ایمان لے آؤ یا شہر چھوڑ کر چلے جاؤ‘ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس لیے کہ حضرت محمدﷺ خاص اُمیین عرب میں سے تھے‘ اور آپؐ نے انہی کی زبان میں اُن پر اتمامِ حجت کر دیا تھا‘ اللہ تعالیٰ نے انہی کی زبان میں اپنی کتاب قرآن حکیم نازل کر دی تھی‘ لہٰذا ان کے لیے اب کوئی عذر

*

باقی نہیں تھا۔ لہٰذا فرمایا گیا کہ ایمان لے آؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے‘ البتہ شہر چھوڑ کر جا سکتے ہو۔ لیکن باقی دنیا کے لیے یہ حکم نہیں تھا۔ جب اُمیین عرب کے لیے یہ اعلان ہو رہا تھا اور سورۃ التوبۃ کی ابتدائی آیات نازل ہو رہی تھیں تو وہاں یہودی بھی موجود تھے‘ مگر ان کے لیے یہ حکم نہیں تھا کہ تم یا تو ایمان لے آؤ‘ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ ان کے لیے حکم ان الفاظ میں نازل ہوا:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٢٩﴾﴾ (التوبۃ)

’’جنگ کرو اہل کتاب میں سے اُن لوگوں کے خلاف جو اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے‘ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔‘‘

دوسری اقوام کے لیے ہمیشہ ہمیش کے لیے تین صورتیں ہیں‘ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فوجیں جہاں بھی گئی ہیں انہوں نے یہی تین شکلیں سامنے رکھی ہیں کہ ایمان لے آؤ تو تم ہمارے برابر کے بھائی ہو جاؤ گے‘ ہم یہ بھی نہیں کہیں گے کہ ہمارے حقوق زیادہ ہیں اور تمہارے کم‘ بلکہ ’’اَلْمُسْلِمُ كُفُوٌ لِكُلِّ مُسْلِمٍ‘‘ کا اصول لاگو ہوگا۔ تمہارے اور ہمارے سیاسی‘ دستوری اور قانونی حقوق برابر ہوں گے۔ اور اگر ایمان نہیں لاتے تو دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے دین کا غلبہ برداشت کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا کرو اور چھوٹے بن کر رہو۔ اس صورت میں تم چاہے یہودی بن کر رہو‘ نصرانی بن کر رہو‘ اور چاہے ہندو‘ سکھ‘ پارسی‘ مجوسی وغیرہ بن کر رہو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تمہارے سینیگاگز‘ چرچز‘ معبدوں اور مندروں کی حفاظت کی جائے گی۔ تمہیں پرسنل لاء کی پوری آزادی دی جائے گی۔ اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے تمہارے لیے کاروبار اور ملازمت کرنے کی اجازت ہوگی۔ ہر چیز کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ البتہ غالب دین اللہ کا ہو گا۔ یہاں یہ بھی جان لیجیے کہ اُمیین عرب کے لیے الفاظ تو انتہائی سخت تھے کہ:

﴿فَاِذَا انۡسَلَخَ الۡاَشۡهُرُ الۡحُرُمُ فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَيۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡهُمۡ وَخُذُوۡهُمۡ وَاحۡصُرُوۡهُمۡ وَاقۡعُدُوۡا لَهُمۡ كُلَّ مَرۡصَدٍ ۚ فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوۡا سَبِيۡلَهُمۡ ؕ﴾ (التوبة:۵)

''پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں بھی تم انہیں پاؤ' اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔ پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔''

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص کے قتل کی نوبت بھی نہیں آئی۔ اکثر اُمیین یعنی بنی اسماعیل ایمان لے آئے اور جو ایمان نہیں لائے وہ جزیرہ نمائے عرب کو خیر باد کہہ کر چلے گئے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی اپنے باپ کی طرح اپنی ہٹ کا پکا تھا۔ اُس نے کہا میں تو ایمان نہیں لاؤں گا۔ لہٰذا وہ حبشہ کی طرف ہجرت کے ارادے سے بحری جہاز میں سوار ہو گیا۔ جیسے کبھی مسلمانوں نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ بحیرۂ قلزم میں طوفان کی وجہ سے جہاز ہچکولے لینے لگا تو عکرمہ بن ابوجہل اور دوسرے سب مشرکین نے اللہ کو پکارا کہ اے اللہ! ہمیں اس مصیبت سے نکال لے۔ عین اُس وقت اُس نے سوچا کہ ہم اس برے وقت میں لات' منات' عزیٰ' ہبل وغیرہ کو چھوڑ کر اللہ ہی کو پکار رہے ہیں تو گویا ہماری فطرت میں اور دلوں میں تو اللہ ہی ہے اور یہ اللہ کے بندے محمد (ﷺ) بھی اسی اللہ ہی کی دعوت تو دے رہے ہیں! تو بھاگ کر کہاں جانا؟ لہٰذا وہ وہیں سے واپس لوٹ کر اسلام لے آئے اور صادق الایمان ثابت ہوئے۔ مسیلمہ کذاب کے خلاف جہاد کیا اور دیگر کئی معرکوں میں شریک ہوئے اور شہادت کا بلند رتبہ حاصل کیا۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ پاکستان میں چترال کے ساتھ ایک علاقہ ''کافرستان'' ہے اور اس کے ساتھ ملتا ہوا افغانستان کا ایک علاقہ ''نورستان'' ہے۔ نورستان کے ایک شیخ جو مہدویت کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ مہدی ہم میں سے ہی ہوں گے' بیان کرتے ہیں کہ ہم نورستان کے رہنے والے بھی قرشی ہیں اور کافرستان کے رہنے والے بھی قرشی ہیں۔ ہمارے آباء واَجداد عرب سے اُس وقت نکلے تھے جب

سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات میں اعلان ہوا تھا کہ مشرکین عرب کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے' اس میں ایمان لے آئیں ورنہ قتل کیے جائیں گے' یا پھر عرب کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ یہ لوگ عرب کو چھوڑ کر بھاگے۔ لیکن جیسے جیسے اسلامی فتوحات کا دائرہ بڑھتا گیا اور مسلمان علاقے فتح کرتے کرتے ایران تک پہنچ گئے تو یہ لوگ بھی آگے بڑھتے بڑھتے اِن پہاڑی علاقوں تک پہنچ گئے اور یہ علاقہ کافرستان کہلانے لگا۔ جب افغانستان کی بنیاد پڑی تو یہ لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک حصہ ہندوستان میں رہ گیا' جو اَب پاکستان میں ہے' اور ایک حصہ افغانستان میں چلا گیا' جس کا نام بدل کر نورستان رکھ دیا گیا۔ ہندوستان میں تو انگریزوں نے انہیں کچھ نہیں کہا اور یہ کافر ہی رہے' مگر افغانستان میں والیٔ کابل امیر دوست محمد خان نے انہیں الٹی میٹم دے دیا کہ ایمان لاؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ چنانچہ یہ لوگ ایمان لے آئے۔ ان کی معاشرتی رسومات ابھی تک مشرکین مکہ سے ملتی جلتی ہیں۔

آیت مذکورہ میں جو فرمایا جا رہا ہے کہ ''پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو'' تو یہ وہی بات ہے جو حدیث زیر درس میں آ رہی ہے کہ:

((وَاِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یُقِیْمُوا الصَّلَاۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکَاۃَ وَیَشْھَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُـہٗ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ فَقَدِ اعْتَصَمُوْا وَعَصَمُوْا دِمَاءَ ھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ اِلَّا بِحَقِّھَا وَحِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ))

''مجھے اِس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں جنگ جاری رکھوں یہاں تک کہ لوگ نماز قائم کریں' زکوٰۃ ادا کریں اور اس بات کی شہادت دیں کہ معبود کوئی نہیں مگر اللہ' جو تنہا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں۔ جب وہ یہ باتیں کر لیں تو وہ خود بھی بچ گئے اور اپنی جان و مال کو بھی بچا لیا' مگر ہاں جو شریعت کی زد میں آ جائے' اور اس کے بعد اُن کا حساب اللہ بزرگ و برتر کے سپرد ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا تھا' حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی رائے دے

رہے تھے کہ فی الحال اندرونِ ملک عرب حالات سازگار نہیں ہیں لہٰذا ان کے خلاف محاذ نہ کھولا جائے۔ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زکوٰۃ کا انکار صرف اس شکل میں کیا تھا کہ ہم زکوٰۃ آپ کو نہیں جمع کروائیں گے' بلکہ اپنے طور پر تقسیم کریں گے' مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف جہاد کیا اور سرخرو ہوئے۔ اسی طرح آپؓ نے مسیلمہ کذاب اور دوسرے جھوٹے مدعیانِ نبوت کے خلاف جہاد کیا' اس لیے کہ وہ مرتد ہو گئے تھے اور واجب القتل تھے۔

اب یہاں دیکھئے کہ اِس قتال فی سبیل اللہ کا مقام کیا ہے۔ حدیث زیر مطالعہ میں رسول اکرم ﷺ فرما رہے ہیں:

((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ مَا شَحَبَ وَجْہٌ وَلَا اغْبَرَّتْ قَدَمٌ فِیْ عَمَلٍ تُبْتَغٰی فِیْہِ دَرَجَاتُ الْجَنَّۃِ بَعْدَ الصَّلَاۃِ الْمَفْرُوْضَۃِ کَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا ثَقَّلَ مِیْزَانَ عَبْدٍ کَدَابَّۃٍ تُنْفَقُ لَـہٗ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَوْ یُحْمَلُ عَلَیْھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ))

''اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! کوئی چہرہ (عمل کرتے کرتے) متغیر نہیں ہوا اور کوئی قدم (سفر کرتے کرتے) غبار آلود نہیں ہوا' کسی ایسے عمل میں جس کا مقصد درجاتِ جنت ہوں فرض نماز کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کے برابر' اور نہ بندہ کے میزانِ عمل میں کوئی نیکی اتنی وزن دار ثابت ہوئی جتنا کہ اس کا وہ جانور جو جہاد فی سبیل اللہ میں مر گیا یا جس پر اُس نے راہِ خدا میں سواری کی۔''

چنانچہ دین اسلام میں سب سے اونچا مقام قتال فی سبیل اللہ اور بالآخر اللہ کی راہ میں جان دے دینا ہے' جس کی شدید تمنا اور آرزو خود رسول اللہ ﷺ کے دل میں موجزن تھی۔ آپ ﷺ نے ایک موقع پر اپنی اس خواہش کا اظہار اِن الفاظ میں فرمایا:

((لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ' ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ))(۱)

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجھاد والسیر' باب تمنی الشھادۃ' وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب فضل الجھاد والخروج فی سبیل اللّٰہ۔

*

''میری بڑی خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں''۔

بعد کے زمانوں میں ہمارے ہاں اس کی جگہ کچھ دوسری چیزوں نے لے لی۔ یعنی اللّٰہ' اللّٰہ کی ضربیں' مراقبے' چلّے اور ان کے ذریعے کچھ روحانیت حاصل کرنا۔ اس سے قتال فی سبیل اللہ اور بالآخر اللہ کی راہ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دینا سب پس منظر میں چلے گئے اور نتیجتاً ہم مغلوب ہوتے چلے گئے۔ ایک مرتبہ خلافت راشدہ کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد دوبارہ آج تک خلافت کا نظام قائم نہیں ہو سکا۔ بس اتنا ہوا کہ دو یا سوا دو سال کے لیے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دورِ مبارک میں اس کی ایک جھلک سی ظاہر ہوئی' اور وہ بھی ایک شخصی سی بات تھی۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کو اچانک حکومت مل گئی تھی۔ اس کے لیے انہوں نے کوئی جہاد نہیں کیا تھا' کوئی جماعت نہیں بنائی تھی' جہاد فی سبیل اللہ کے مراحل میں سے نہیں گزرے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ صحابی نہیں ہیں' تابعی ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نواسے ہیں۔ بہرحال اس کے بعد آج تک خلافت کا نظام دوبارہ نہیں آیا' اس لیے کہ ترجیحات بدل گئیں۔ روحانیت کے نام سے ایک اور ہی تصور ذہنوں میں راسخ ہو گیا۔ صوفیائے کرام اور بڑے بڑے اولیائے عظام رحمۃ اللہ علیہم کے بارے میں قصے مشہور ہیں کہ انہوں نے چالیس چالیس برس تک جنگلوں میں رہ کر ریاضت کی۔ واللہ اعلم! ایک امام فقیہہؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے چالیس برس تک عشاء کے وضو کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی۔ اب معلوم نہیں یہ روایت صحیح ہے یا غلط ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تو یہ ہے کہ میں رات کو سوتا بھی ہوں اور کھڑا رہ کر عبادت بھی کرتا ہوں۔ آپؐ کی سنت تو یہ ہے۔

اس روحانیت کے لیے بھی دین میں گنجائش ہے' مگر اس وقت جب اللہ کا دین قائم ہو جائے۔ ایک بار اللہ کا دین قائم ہو جائے تو اب اس دین کو آگے پھیلانا اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ جب آپ سے مطالبہ کیا جائے گا کہ آؤ نکلو میدان میں تو آپ کو نکلنا پڑے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں شام اور ایران میں جہاد و قتال ہو رہا

تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ مطالبہ آ گیا کہ فلاں محاذ پر دس ہزار آدمی چاہئیں۔ مسجد نبویؐ میں اعلان کیا گیا تو دس ہزار آدمی نکل آئے جنہیں محاذ پر روانہ کر دیا گیا۔ باقی اپنے گھروں کے اندر ہیں اور ان پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ گویا قتال فی سبیل اللہ فرضِ کفایہ کے درجے میں تھا۔ باقی لوگ گھروں میں بیٹھے نوافل پڑھ رہے ہوتے تھے' تلاوتِ قرآن اور وظائف و اَوراد میں مصروف رہتے تھے اور اس کے ذریعے سے اپنی روحانیت کو ترقی دیتے تھے' جو بالکل درست تھا۔

ایک حدیث نبویؐ کی رُو سے اللہ کے قرب کے حصول کے دو ذریعے ہیں: تقرب بالفرائض اور تقرب بالنوافل۔ ان میں سے اہم ترین درجہ تقرب بالفرائض کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند یہ ہے کہ اس کا بندہ فرائض کے ذریعے سے اس سے قرب حاصل کرے۔ لیکن نوافل کے ذریعے سے بھی تقرب حاصل ہوتا ہے اور اس کا بھی بہت اونچا مقام ہے' بشرطیکہ فرض کی تکمیل ہو چکی ہو۔ اگر آپ نے فرض تو ادا کیا نہیں اور نوافل کے ڈھیر لگاتے جا رہے ہوں تو وہ نوافل کیسے قبول ہوں گے؟ لیکن ہمارے ہاں یہی ہوا کہ دین غالب نہیں تھا' لیکن دین کو غالب کرنے کی جدوجہد کو اعمال کی فہرست سے نکال دیا گیا اور نوافل کے ذریعے سے' چلّوں کے ذریعے سے اور دیگر اَوراد و وظائف کے ذریعے سے روحانیت پر زور رہا۔ سب مانتے ہیں کہ سلوک کے جتنے بھی طریقے رائج ہیں جن سے خانقاہی نظام بنایا گیا ہے' یہ سب غیر مسنون ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ طریقے مفید نہیں ہیں۔ مفید ضرور ہیں' ان سے انسان میں ایک روحانی کیفیت اور روحانی برتری پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے جسمانی ورزش سے انسان کے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں' اسی طرح روحانی ورزش کے ذریعے سے انسان کی روح کے اندر تقویت پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں' لیکن ہمارے لیے اُسوہ ہے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریق کار' اور وہ ہے جہاد اور قتال فی سبیل اللہ۔ نفلی روزوں کی طرح اس میں بھی بھوک برداشت کرنی پڑتی ہے اور پیاس بھی۔ غزوۂ تبوک کے لیے جاتے ہوئے کس قدر بھوک کا عالم تھا! تو نفلی روزوں کے ذریعے انسان جو کیفیت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ جہاد کی صعوبتیں جھیلنے سے بھی لازماً حاصل ہوتی ہے اور اس سے بھی روحانی ترقی

*

حاصل ہوتی ہے۔ جب ایک بندۂ مؤمن محاذِ جنگ پر پہنچا ہوا ہے اور اسے معلوم ہے کہ صبح مقابلہ پیش آنا ہے اور ایک لاکھ مسلح فوج سے ہماری تین ہزار فوج کو سامنا کرنا ہے تو وہ بندۂ مؤمن جس کیفیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑائے گا اور دعائیں کرے گا تو کیا گھر بیٹھے کسی شخص کو ایسا تضرع اور خشوع وخضوع حاصل ہوسکتا ہے؟ قطعاً نہیں۔ تو حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا راستہ جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ ہے۔

صحیح ترین جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ کے لیے کچھ شرائط اور لوازم ہیں۔ پہلے ایمانِ حقیقی دلوں میں راسخ کیا جائے' اور اس کا ثبوت ہوگا شریعت پر عمل۔ جس جس حکم پر عمل ہوسکتا ہے وہ تو ہو! اس کے بعد ہے تنظیم۔ یعنی ایسے لوگوں کو بیعت کے ذریعے سے جوڑا جائے' ان کا تزکیہ کیا جائے۔ اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح کے سوا کوئی اور امنگ دل میں ہے تو اسے نکال کر اور دل کو صاف کیا جائے۔ یہ سب پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں پھر صحیح جہاد فی سبیل اللہ کی منزل آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بارہ برس تک مکہ مکرمہ کے اندر یہی کچھ کیا تھا۔ انہوں نے تکالیف جھیلیں' ماریں کھائیں' ان میں سے بعض کے جسم کے ٹکڑے کر دیے گئے' زندہ جلا دیے گئے لیکن انہوں نے ہاتھ نہیں اٹھائے۔ آپ ﷺ کی کامیابی کے رازوں میں سے سب سے بڑا راز یہی ہے۔ حضرت سمیہ اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہما رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نگاہوں کے سامنے شہید کیے گئے۔ جب ابوجہل ان پر تشدد کر رہا تھا تو آنحضور ﷺ فرما رہے تھے: ((اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِرَ' فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ)) ''اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو' تمہارے وعدے کی جگہ جنت ہے''۔ ایسے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ حکم نہیں دیا کہ ابوجہل کے ٹکڑے کر دو۔ اسی طرح آپ ﷺ نے کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو بھی نہیں چھیڑا' بلکہ بارہ برس تک اسی کعبہ کا طواف کرتے رہے۔ اس لیے کہ طواف تو وحی سے پہلے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے چلا آ رہا تھا اور پھر آغازِ وحی کے بعد بارہ برس تک پورے مکی دور میں جاری رہا اور کعبہ شریف میں نمازیں ادا کی گئیں جبکہ دائیں بائیں بت موجود تھے۔ بہرحال اگر ہم اسلامی انقلاب کے لیے رسول اللہ ﷺ کا منہج اختیار نہیں کریں گے تو لال مسجد اور جامعہ حفصہ جیسے واقعات ہوتے رہیں گے۔ صرف جذبے اور

خلوص سے بات نہیں بنے گی جب تک آپ ﷺ کا اسوہ ہمارے سامنے نہ ہو۔ کسی شاعر نے کیا عمدہ بات کہی ہے: ؎

خلافِ پیمبر کسے راہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

رسول اللہ ﷺ کے منہج سے ہٹ کر اختیار کیا گیا کوئی راستہ منزل تک نہیں پہنچے گا۔ البتہ نیک نیتی اور خلوص کا اجر و ثواب اللہ کے ہاں مل جائے گا۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے اور بہت شدومد کے ساتھ ہے۔ اسی لیے تو غیروں کو قرآن مجید پر شدید اعتراض ہے اور وہ اس سے کانپتے ہیں۔ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے کہ برطانیہ کے بہت بڑے لیڈر اور وزیر اعظم گلیڈسٹون نے برٹش پارلیمنٹ میں قرآن مجید کا نسخہ لہرا کر کہا تھا کہ جب تک یہ کتاب دنیا میں موجود ہے امن قائم نہیں ہوسکتا۔ اور اب انہوں نے 'نعوذ باللہ' اوراقِ قرآن کو گٹر کے اندر بہا کر اپنی خباثت اور دلوں کے اندر موجود خوف کا اظہار کیا ہے۔ ایسے ہی ایک مرتبہ کلکتہ ہائی کورٹ نے بھی ایک فیصلہ دے دیا تھا کہ قرآن مجید کو بین کر دیا جائے۔ ظاہر ہے وہ اپنے اس فیصلے پر عمل درآمد نہیں کرا سکتے تھے' اس لیے کہ وہاں بیس بائیس کروڑ مسلمان موجود ہیں جن کی غیرتِ دینی ہماری غیرتِ دینی سے سو گنا زیادہ ہے۔ اسی کلکتہ ہائی کورٹ نے شاہ بانو کیس کے سلسلے میں مسلمانوں کے عائلی قوانین میں تھوڑی سی ترمیم کی تھی۔ وہ اس طرح کہ اسلامی قانون تو یہ ہے کہ کسی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو وہ دورانِ عدت اس کے نان نفقہ کا ذمہ دار ہے۔ لیکن شاہ بانو کی درخواست پر کلکتہ ہائی کورٹ نے فیصلہ دے دیا کہ جب تک مطلقہ عورت دوسری شادی نہ کر لے یا فوت نہ ہو جائے اس کا نان نفقہ اس کے سابقہ شوہر کے ذمے رہے گا۔ کورٹ نے اگرچہ شریعت کی کوئی چیز کاٹی نہیں تھی' البتہ شریعت میں اضافہ ضرور کیا تھا' لہٰذا اس پر وہاں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ مسلمانوں کا پرسنل لاء بورڈ بنا۔ ساری دینی جماعتوں نے جمع ہو کر تحریک چلائی اور سینکڑوں لوگوں نے جانیں دیں۔ بالآخر وزیر اعظم راجیو گاندھی کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور اس نے لوک سبھا (پارلیمنٹ) میں دوٹوک انداز میں کہا کہ آئندہ

*

ہندوستان کی سپریم کورٹ سمیت کوئی عدالت مسلمانوں کے عائلی قوانین میں دخل نہیں دے سکتی' اور یہ بھی کہا کہ اس سے پہلے میں نے اسلام کی سماجی تعلیمات کا مطالعہ نہیں کیا تھا' لیکن اب میں نے مطالعہ کیا ہے تو میں اعتراف کرتا ہوں کہ جو حقوق اسلام نے عورتوں کو دیے ہیں وہ دنیا کے کسی مذہب نے نہیں دیے۔ مولانا علی میاںؒ نے اپنی کتاب میں یہ سارا واقعہ نقل کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' اصل جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ کی کچھ شرائط' کچھ لوازم اور کچھ مراحل ہیں۔ البتہ ایک اور قتال ہو سکتا ہے جو جائز ہے' اسے سمجھ لیجیے۔ فرض کیجیے ایک مسلمان ملک ہے' اگرچہ اس میں خالص اسلامی نظام نہیں ہے' اس پر اگر کوئی دوسرا ملک حملہ کرتا ہے تو اپنے دفاع میں کھڑے ہو جانا ایک طرح کا جہاد ہے۔ اس لیے کہ اب تمام مراحل سے گزرنے کا موقع نہیں ہے۔ کیونکہ ختم کر دو یا ختم ہو جاؤ والی صورتِ حال ہے۔ البتہ یہ جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے' کیونکہ وہ مراحل نہیں آئے جو جہاد فی سبیل اللہ کی لازمی شرط ہے۔ اسی لیے روس کے خلاف جہادِ افغانستان جہاد فی سبیل اللہ نہیں تھا' لیکن وہ جہاد جائز ضرور تھا۔ اور اس میں جس نے جان دی ہے وہ شہید ہے' واللہ اعلم! اسی طرح کوئی بڑا ملک ہے اور اس کے کسی ایک حصہ کے اندر مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہ اس سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں' آزادی چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنی مرضی سے' اسلامی اصولوں کے مطابق اپنا نظام چلائیں' جیسا کہ اِس وقت فلپائن' کمبوڈیا اور کشمیر میں ہو رہا ہے' تو یہ بھی جائز ہے اور اِس میں جان دینا بھی شہادت ہے۔ اگرچہ میرے خیال میں ہندوستان کے ایک خاص پس منظر میں کشمیر کے حوالے سے وہاں پر اگر سیاسی تحریک چلائی جاتی تو وہ بہتر ہوتی۔ لیکن جہاد کشمیر بہر حال ناجائز نہیں ہے۔ اپنی آزادی کی خاطر لڑنا' یعنی جہاد فی سبیل الحریت' جائز ہے۔ اس کے لیے تربیت' تزکیہ' تنظیم وغیرہ ایسے مراحل ضروری نہیں ہیں۔ لیکن وہ جدوجہد جس کے ذریعے آپ کسی ملک میں اسلام کو غالب کرنا چاہتے ہیں' وہ اگر عین نبی اکرم ﷺ کے اُسوہ کے مطابق ہو گی اور جہاد کی تمام شرائط اور لوازم کو پورا کر کے اور تمام مراحل میں سے گزر کر ہو گی تو وہ پھر صحیح معنوں میں قتال فی سبیل اللہ قرار پائے گی۔

مغربی دنیا کو مسلمانوں کے جذبۂ جہاد اور ذوقِ شہادت سے ہمیشہ سے خوف رہا ہے۔ انہیں تو زندگی بہت عزیز ہے اور وہ موت سے خائف ہیں‘ لیکن بندۂ مؤمن کو شہادت بہت زیادہ عزیز ہے: ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت‘ نہ کشور کشائی!

اس لیے مغربی دنیا نے بہت عرصہ پہلے اسکیمیں شروع کیں کہ مسلمانوں میں ایسی تحریکیں اٹھائی جائیں جو جہاد کو باطل قرار دیں۔ بدنامِ زمانہ غلام احمد قادیانی آنجہانی درحقیقت اسی فکر اور اسی سوچ کا نتیجہ ہے۔ اُس بدبخت نے نبوت کا دعویٰ کیا اور قتال کو حرام قرار دے دیا کہ ع ”دین کے لیے حرام ہے اب دوستو قتال!“ جبکہ ایک حدیث نبویؐ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْجِھَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِیَ اللّٰہُ اِلٰی اَنْ یُقَاتِلَ آخِرُ اُمَّتِی الدَّجَّالَ))(۱)

”جہاد اُس وقت سے جاری ہے جب سے مجھے اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا ہے اور جاری رہے گا یہاں تک کہ میری اُمت کا آخری حصہ دجال کے خلاف جنگ کرے گا۔“

اب اس ایک حدیث میں جہاد اور قتال دونوں آ گئے۔ جیسے سورۃ الصّف میں جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ دونوں آ گئے۔ احادیثِ نبویؐ میں قیامت سے قبل جن جنگوں کی پیشین گوئی کی گئی ہے ان جنگوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ احادیث میں آیا ہے کہ پہلے رومیوں سے جنگیں ہوں گی‘ چنانچہ وہ ہو رہی ہیں۔ عیسائی مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بہت بڑی جنگ ہو گی جس میں عیسائی اسّی جھنڈے لے کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوں گے اور ہر جھنڈے کے نیچے بارہ ہزار فوج ہو گی۔ احادیث کی رو سے آخری مرحلے میں یہودی مدمقابل آئیں گے۔ آپ غور کیجیے کہ عراق کے خلاف خلیج کی پہلی جنگ میں یہودیوں کو سامنے نہیں لایا گیا۔ حالانکہ اتنا بڑا اتحاد بنایا گیا تھا جس میں عراق کے خلاف تقریباً سارے عرب ممالک بھی شامل ہو گئے تھے‘ لیکن اسرائیل سے کہہ دیا گیا تھا کہ تم میدان میں نہ آنا‘ تم بیٹھے رہو‘ تمہاری حفاظت

(۱) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الجھاد‘ باب فی الغزو مع ائمۃ الجور۔

*

کا ذمہ ہم لیتے ہیں۔ اگر تمہیں صدام کے سکڈ میزائل سے خطرہ ہے تو اس کو فضا ہی میں ختم کرنے والے پیٹریاٹ میزائل ہم تمہیں دے دیتے ہیں' لیکن تم سامنے مت آنا۔ اور اب بھی یہی ہوا ہے۔ عراق اور افغانستان پر جارحیت کے لیے کتنا بڑا اتحاد بنایا گیا ہے! افغانستان پر حملے میں تو واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین اتحاد وجود میں آیا ہے۔ اس میں سارا عالمِ کفر جمع ہو چکا ہے۔ صرف برطانیہ اور بقیہ یورپ ہی نہیں بلکہ چائنا اور روس جو امریکہ کے حریف ہیں' افغانستان کی جنگ میں اِن دونوں کی مرضی بھی شامل تھی اور آج بھی ہے۔ لیکن احادیث نبویہ ﷺ کی رو سے اس کے بعد ایک آخری مرحلہ آئے گا جب تمام یہودی مسلمانوں کے مقابلے میں صف آراء ہو جائیں گے اور یہودیوں کا لیڈر ہو گا المسیح الدجال۔ اس موقع پر پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو گا جو دجال کو قتل کریں گے۔ اُس وقت تک اُمت مسلمہ کے اندر جہاد و قتال کا سلسلہ جاری رہے گا' اس کو بند کرنے والا کوئی نہیں ہے!

بہر حال یہ بتانا اور جاننا مقصود ہے کہ دین کی اقدار کیا ہیں۔ کون سی چیز پہلے اور کون سی بعد میں ہے۔ روحانی اقدار بھی مطلوب ہیں' رات کی نماز بھی نہایت پسندیدہ عمل ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ غلبۂ دین کی جدوجہد بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا صحیح فہم اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے' آمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ OO

(مرتب: طارق اسماعیل ملک' ادارتی معاون)

تعمیر سیرت

ایمان کے تین اہم تقاضے

عتیق الرحمٰن صدیقی

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴿۱۰۲﴾
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ
اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى
شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴿۱۰۴﴾﴾ (آل عمران)

’’اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے اور تمہیں ہرگز موت نہ آنے پائے مگر اس حال میں کہ تم اسلام پر ہو۔ اور اللہ کی رسّی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور متفرق نہ ہو‘ اور اپنے اوپر اللہ کے اس فضل کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا اور تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے تو اللہ نے تمہیں اس سے بچالیا۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی ہدایات کو واضح کرتا ہے تاکہ تم راہ یاب ہو۔ اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے‘ معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے‘ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔‘‘

یہ چوتھے پارے کے دوسرے رکوع کی پہلی تین آیتیں ہیں‘ جن میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے مخاطب ہو کر ان کی تین اہم ذمہ داریوں کی نشاندہی کی ہے۔ ایمان لانے والوں کی جو ذمہ داریاں ہیں انہیں قرآن حکیم نے مختلف مقامات پر مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے اہل ایمان سے تین تقاضے بیان کیے گئے ہیں:

☆ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے‘ اور تم ہرگز مت مرنا مگر اس حال

میں کہ تم مسلم ہو۔

☆ سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔

☆ تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں' بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔

اِتَّقٰی ' یَتَّقِیُ ' اِتِّقَاءً باب اِفتعال ہے' اِتَّقُوْا اسی سے امر کا صیغہ ہے اور اسی سے لفظ تقویٰ ہے جس کے معنی ظاہر و باطن میں کھلے اور چھپے اللہ سے ڈرنا اور اس کی نافرمانی سے بچنا ہے۔ تقویٰ کے اصل معنی نفس کو ہر اُس چیز سے بچانے اور محفوظ رکھنے کے ہیں جس سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ گاہے خوف اور تقویٰ ایک دوسرے کے معنوں میں استعمال ہو جاتے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ نفس کو ہر اُس چیز سے بچانے اور محفوظ رکھنے کا نام ہے جو گناہ کا باعث ہو اور اس کا حصول اس طرح ہے کہ کوئی شخص نہ صرف شریعت کی منع کردہ باتوں سے رک جائے بلکہ اس میں درجۂ کمال حاصل کرنے کے لیے بعض مباحات (جائز اشیاء) کو بھی چھوڑ دے۔ (مفردات القرآن)

متذکرہ بالا تین آیات میں سے پہلی آیت کریمہ میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے' یعنی اللہ سے ڈرو اور اس کی نافرمانی سے بچو۔ تقویٰ کا لفظ اپنے اندر اتنی جامعیت رکھتا ہے کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں:

> ''اگر محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں۔ اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے۔ قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہیں (هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ) اسلام کی ساری عبادتوں (روزہ' حج' قربانی وغیرہ) کا منشاء اسی تقویٰ کا حصول ہے......
> اسلام کا اخلاقی نظام بھی اسی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے''۔ (سیرت النبی' جلد پنجم)

خوف کھانا ایک جبلی فعل ہے۔ اس میں شدت بھی پیدا کی جا سکتی ہے اور کمی بھی' بلکہ تعلیم و تربیت اور ایک بہتر ماحول کی تشکیل سے اس رجحان میں نہ صرف توازن پیدا کیا جانا ممکن ہے بلکہ اس کی تصعید کے لیے تربیت کا معقول اہتمام کر کے اس کو نہایت موزوں جہت عطا کی جا سکتی ہے۔ اور اگر طرزِ معاشرت کو نفسیاتی اور روحانی اصولوں کی روشنی میں سنوارنے کی سعی کی جائے تو بے شمار خرابیوں اور برائیوں کا مداوا ممکن ہے۔ اسلام دین فطرت ہے۔ وہ انسان

کی جسمانی، ذہنی اور فکری نشو ونما کے لیے عمدہ غذا تجویز کرتا ہے جو اُس کے ظاہر کو اجالنے کے ساتھ ساتھ اس کے باطن کا تصفیہ بھی کرتی ہے۔ مذکورہ آیت میں یہ فرمایا کہ اللہ سے اسی طرح ڈرتے رہو جس طرح اس سے ڈرتے رہنا کا حق ہے۔ ڈرنے کے جبلی رجحان کو بہتر رُخ اسی وقت دیا جا سکتا ہے جب اس پر خالق سے ڈرنے اور مخلوق سے خوف کھانے کا فرق پوری طرح واضح ہو جائے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''خدا سے ڈرنے اور دوسروں سے ڈرنے میں بڑا فرق ہے۔ اس وجہ سے ارشاد ہوا کہ خدا سے ڈرتے رہو جس طرح خدا سے ڈرتے رہنے کا حق ہے۔ اوّل تو بندے پر خدا کے جو حقوق ہیں وہ کسی اور کے نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ خدا نے جو حدود و قیود قائم کیے ہیں اور ان کے توڑنے کی جو سزا مقرر کی ہے وہ تمام تر بندوں کی دنیوی اور اُخروی بہبود کے لیے کی ہے، ان کی پابندی سے خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ بندوں ہی کو پہنچتا ہے۔ تیسری یہ کہ خدا کی آنکھیں ہر جگہ نگران ہیں، یہاں تک کہ وہ دلوں کے وسوسوں سے بھی باخبر ہے۔ چوتھی یہ کہ خدا کی پکڑ سے کوئی دوسرا بچا نہیں سکتا اور وہ دنیا و آخرت دونوں میں سزا دے سکتا ہے اور ہمیشہ کے لیے دے سکتا ہے۔ خدا سے ڈرنے میں جب تک بندہ ان تمام پہلوؤں کو مدنظر نہ رکھے وہ خدا سے ڈرنے کا صحیح مفہوم سمجھ بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ وہ اس کا صحیح حق ادا کر پائے۔ بہت سے لوگ جو انسانوں سے ڈر کر خدا اور اس کی شریعت کو چھوڑ بیٹھتے ہیں ان کی بنیادی گمراہی یہی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی مخالفت اور خدا کے غضب میں فرق نہیں کر پاتے''۔ (تدبر قرآن، جلد دوم)

بندۂ مؤمن ہر لحظہ چوکنا اور ہوشیار رہتا ہے کہ کہیں بدی کے داغ دھبے سے اس کا دامن آلودہ نہ ہونے پائے۔ یہ ڈر اور خوف وقتی، ہنگامی اور لمحاتی نوعیت کا نہ ہو کہ صرف حوادث کے مواقع پر یا پریشانی اور تکلیف کے لمحوں میں ابھر کر آ جائے بلکہ یہ مرتے دم تک قائم رہے، اس کی نوعیت جہدِ مسلسل کی سی ہو، اس لیے کہ یہ تسلسل اگر کہیں ٹوٹ جائے تو ساری عمر کی محنت کے اکارت جانے کا خطرہ ہے۔ صاحبِ تدبر قرآن فرماتے ہیں:

''آیت کے اسلوب میں یہ بات بھی مخفی ہے کہ یہ راہ بہت ہموار نہیں ہے، بلکہ اس میں بہت سے نشیب وفراز اور ہر قدم پر اتار چڑھاؤ ہیں۔ اس میں آزمائشوں اور فتنوں سے دوچار ہونا ہو گا اور شیاطین کے شب خونوں اور معاندین کی دراندازیوں اور فساد انگیزیوں سے سابقہ پیش آئے گا۔ کبھی طمع ورغلانے کے لیے عشوہ گری کرے گی، کبھی

خوف دھمکانے کے لیے اپنا اسلحہ سنبھالے گا۔ جو ان سب مرحلوں میں اپنا ایمان و اسلام بچاتا ہوا منزل پر پہنچا اور اسی حال میں اس نے جان، جان آفریں کے سپرد کی درحقیقت وہ ہے جو خدا سے اس طرح ڈرا جس طرح خدا سے ڈرنے کا حق ہے اور یہی ہے جسے اعتصام باللہ کا مقام حاصل ہوا''۔ (تدبر قرآن، جلد دوم)

پہلی آیت کے کلمات کی تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ربیع، قتادہ اور حسن بصری نے رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بایں الفاظ روایت کی ہے: ((حق تقاته هو ان يطاع فلا يعصى ويذكر فلا ينسى ويشكر فلا يكفر)) یعنی ''اللہ تعالیٰ کی ایسی اطاعت کی جائے کہ اس میں نافرمانی کا شائبہ نہ ہو۔ اس کو ایسا یاد کیا جائے کہ غفلت طاری نہ ہو اور اس کا یوں شکر ادا کیا جائے کہ اس میں ناشکری کی آمیزش نہ ہو''۔ (بحر محیط)

ائمہ تفسیر میں سے بعض نے کہا کہ حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی کی ملامت اور برائی کی پروا نہ کرے اور ہمیشہ انصاف پر قائم رہے اگرچہ انصاف کرنے میں خود اپنا یا اپنی اولاد یا ماں باپ ہی کا نقصان ہوتا ہو۔ (معارف القرآن، دوم) اور ''تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو'' جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کیا کہ مرتے دم تک اللہ کی فرماں برداری اور وفاداری پر قائم رہا جائے۔

مندرجہ بالا سطور میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے قیام کا ایک اہم اصول بیان کیا گیا ہے جو ایمان کا تقاضا بھی ہے، یعنی اللہ سے ڈرنے اور اس کی ناپسندیدہ چیزوں سے بچنے کا مکمل اہتمام جو اللہ تعالیٰ کے حق کے مطابق ہو۔

دوسری آیۂ کریمہ میں نہایت حکیمانہ انداز میں وہ اصول بتایا گیا جو مسلمانوں کو باہم مربوط اور متفق رکھنے کا نسخۂ اکسیر ہے، یعنی ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا﴾ ''مضبوطی سے پکڑ لو اللہ کی رسّی سب مل کر''۔ اللہ کی رسّی سے مراد قرآن مجید ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((كِتَابُ اللّٰهِ هُوَ حَبۡلُ اللّٰهِ الۡمَمۡدُوۡدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الۡاَرۡضِ)) یعنی ''کتاب اللہ، اللہ تعالیٰ کی رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے''۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی روایت میں ((حَبۡلُ اللّٰهِ هُوَ الۡقُرۡآنُ)) کے الفاظ آئے ہیں۔ (ابن کثیر) حبل کے لغوی معنی ''السبب الذى يوصل به الى البغية'' (القرطبی) یعنی ''وہ چیز جو مقصد تک پہنچنے کا سبب ہو''۔ عربی محاورہ میں حبل سے مراد عہد بھی ہوتا ہے۔ قرآن کو یا دین کو رسّی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہل

ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔ سید مودودی لکھتے ہیں:

''اللہ کی رسّی سے مراد اس کا دین ہے اور اس کو رسّی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہل ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔ اس رسّی کو ''مضبوط پکڑنے'' کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اصل اہمیت دین کی ہو' اسی سے ان کو دلچسپی ہو' اسی کی اقامت میں وہ کوشاں رہیں اور اسی کی خدمت کے لیے آپس میں تعاون کرتے رہیں۔ جہاں دین کی اساسی تعلیمات اور اس کی اقامت کے نصب العین سے مسلمان ہٹے اور ان کی توجہات اور دلچسپیاں جزئیات وفروع کی طرف منعطف ہوئیں پھر ان میں لازماً وہی تفرقہ اور اختلاف رونما ہو جائے گا جو اس سے پہلے انبیاء کی اُمتوں کو ان کے اصل مقصد حیات سے منحرف کر کے دنیا اور آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا کر چکا ہے''۔ (تفہیم القرآن' جلد اوّل)

مولانا شبیر احمد عثمانی رقمطراز ہیں:

''یعنی سب مل کر قرآن کو مضبوط تھامے رہو جو خدا کی مضبوط رسّی ہے' یہ رسّی ٹوٹ تو نہیں سکتی ہاں چھوٹ سکتی ہے۔ اگر سب مل کر اس کو پوری قوت سے پکڑے رہو گے کوئی شیطان شرانگیزی میں کامیاب نہ ہو سکے گا اور انفرادی زندگی کی طرح مسلم قوم کی اجتماعی قوت بھی غیر متزلزل اور ناقابلِ اختلال ہو جائے گی۔ قرآن کریم سے تمسک کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے بکھری ہوئی قوتیں جمع ہوتی ہیں اور ایک مردہ قوم حیاتِ تازہ حاصل کرتی ہے۔ لیکن تمسک بالقرآن کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کو اپنی آراء اور اہواء کا تختۂ مشق بنا لیا جائے' بلکہ قرآن حکیم کا مطلب وہی معتبر ہوگا جو احادیثِ صحیحہ اور سلف صالحین کی متفقہ تصریحات کے خلاف نہ ہو''۔ (تفسیر عثمانی)

آیۂ کریمہ میں مضبوط پکڑنے کے ساتھ **جَمِيْعًا** کی تاکید کی گئی ہے اور **لَا تَفَرَّقُوْا** کی نہی سے واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ چیز جماعتی حیثیت سے مطلوب ہے۔ سب مل کر مضبوطی سے تھامیں گے تو مسلمانوں کی شیرازہ بندی ممکن ہوگی' اسے چھوڑیں گے تو شیرازہ پراگندہ اور ابتر ہو کر رہ جائے گا۔ مولانا اصلاحی فرماتے ہیں:

''اگر اس کے ساتھ تعلق میں ضعف پیدا ہو گیا' اس کی جگہ انہوں نے دوسری رسیوں کا سہارا لے لیا اور حق و باطل کو جانچنے کے اس سے الگ کچھ معیارات بنا لیے تو وہ بھی اسی طرح

پراگندہ ہو جائیں گے جس طرح یہود و نصاریٰ پراگندہ ہو گئے''۔(تدبر قرآن' جلد دوم)

اس کے بعد اس عظیم احسان کی یاد دہانی بھی فرمائی گئی ہے جو اس کتاب کے ذریعہ عرب قوم پر ہوا۔صاحب تفہیم القرآن لکھتے ہیں:

''قبائل کی باہمی عداوتیں' بات بات پر ان کی لڑائیاں اور شب و روز کے کشت و خون جن کی بدولت قریب تھا کہ پوری عرب قوم نیست و نابود ہو جاتی' اس آگ میں جل مرنے سے اگر کسی چیز نے انہیں بچایا تو یہی نعمت اسلام تھی''۔(تفہیم القرآن)

اور صاحب تدبر قرآن کے الفاظ میں:

''لیکن اس حبل اللہ نے ان کو ایک رشتہ میں پرو کر اُن کو موتیوں کی لڑی بنا دیا اور وہ جو ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے ایک دوسرے کے جگری دوست اور غم خوار بن گئے۔مطلب یہ ہے کہ اگر اس حالت کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس حبل اللہ کے ساتھ اپنی وابستگی کو برقرار رکھو' اگر یہ رشتہ کمزور ہوا تو پھر وہی جاہلیت کی حالت لوٹ آئے گی' جس میں اس سے پہلے مبتلا تھے۔تم تباہی کے گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے خدا نے تم کو اس سے بچایا ہے۔اس کو چھوڑ کر پھر اسی گڑھے میں گرنے کا سامان نہ کر لینا''۔(تدبر قرآن)

مسلمانوں کی قومی اور اجتماعی فلاح کا انحصار اس امر پر ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے اور اللہ کے نازل کردہ مینارۂ نور سے مسلسل روشنی حاصل کی جائے۔یوں **اعتصام بحبل اللّٰہ** کے ذریعے اپنی اصلاح کی جائے اور پھر اُمت دعوت ہونے کے ناطے سے دعوت و تبلیغ کے ذریعے دوسروں کی اصلاح کی فکر کی جائے۔سورۃ العصر کا موضوع بھی یہی ہے کہ آخرت کے خسارہ سے صرف وہ لوگ محفوظ ہیں جو خود بھی ایمان اور عمل صالح کے پابند ہیں اور دوسروں کو بھی عقائد صحیحہ اور اعمالِ صالحہ کی ہدایت کرتے رہتے ہیں''۔یہی وہ ایمان کا ایک ناگزیر تقاضا ہے جس کی تلقین تیسری آیت میں کی گئی ہے۔بھلائی کی دعوت' معروف کا حکم اور برائی سے روکنا **اعتصام بحبل اللّٰہ** پر قائم رہنے اور لوگوں کو قائم رکھنے کے لیے لازمی اور ضروری ہے' بلکہ یہ اسلامی نظامِ زندگی کی حقیقی روح ہے۔یہاں اس فریضہ کے تین مدارج بیان کیے گئے' پہلے مرحلہ میں دعوت و تبلیغ کا ایسا اسلوب کہ داعی قریہ قریہ بستی بستی دعوت کا پیغام پہنچائے' طعن و تشنیع کے تمام وار سہے' استہزاء اور تضحیک برداشت کرے اور گالیاں کھا کر بھی بے مزہ نہ ہو' نامساعد حالات میں صبر و استقامت اختیار کیے رکھے' مگر قوت و طاقت کے استعمال سے گریز

کرے، وہی نمونہ اپنے پیش نگاہ رکھے جو حضور نبی کریمﷺ نے مکی زندگی میں اختیار کیا اور پھر مدنی دور کی مانند قوت و طاقت اور اقتدار مل جانے پر تلوار کے زور پر برائی کا قلع قمع کرے اور باطل کو سرنگوں کرنے کے لیے تمام تر توانائیاں استعمال میں لائے۔ یہاں آیت کریمہ میں امر و نہی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان کا غالب قرینہ یہی ہے کہ یہ کام مجرد وعظ و تلقین سے انجام نہیں پا سکتا بلکہ اس کے لیے سیاسی اقتدار و اختیار ضروری ہے۔

صاحب تدبر قرآن لکھتے ہیں:

''اگر تنہا دعوت و تبلیغ ہی سے یہ کام لینا مدّ نظر ہوتا تو اس مطلب کو ادا کرنے کے لیے 'یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ' کے الفاظ کافی تھے 'یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ' (الآیہ) کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے نزدیک اس آیت سے اس اُمت کے اندر خلافت کے قیام کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے نبیﷺ کی وفات کے بعد پہلا کام جو کیا وہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا قیام تھا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد تھا کہ وہ اس امر کی نگرانی کرے کہ مسلمان اعتصام باللہ کے نصب العین سے ہٹنے نہ پائیں۔ اس کے لیے جو طریقے اس کو اختیار کرنے تھے وہ اصولی طور پر تین تھے: دعوت اِلی الخیر' اَمر بالمعروف' نہی عن المنکر۔ انہی تین سے خلافت راشدہ کے دور میں وہ تمام شعبے وجود میں آئے جو ملت کی تمام داخلی و خارجی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کا ذریعہ بنے''۔ (تدبر قرآن' جلد دوم)

مکہ معظّمہ سے سوئے مدینہ منورہ ہجرت کا وقت قریب آنے پر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمﷺ کو یہ دعا تلقین فرمائی:

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا﴿۸۰﴾﴾ (بنی اسراءیل)

''اور دعا کرو کہ پروردگار! مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔''

اس آیۂ کریمہ کی توضیح کرتے ہوئے سید مودودی حضور نبی کریمﷺ کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں:

((اِنَّ اللّٰہَ لَیَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا یَزَعُ بِالْقُرْآنِ))

''اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدباب کر دیتا ہے جن کا سدّ باب

قرآن سے نہیں کرتا''۔

اور مزید لکھتے ہیں:

''اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف وعظ وتذکیر سے نہیں ہوسکتی' بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ پھر جبکہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیﷺ کو خود سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامتِ دین اور نفاذِ شریعت اور اجرائے حدود اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ مطلوب ومندوب ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں''۔ (تفہیم القرآن' جلد دوم)

اس عالمِ انسانیت میں آغاز ہی سے خیر وشر میں ٹکراؤ موجود رہا ہے' رزمِ حق وباطل میں مؤمن فولاد کی مانند سینہ سپر رہتا ہے' دین حق کے غلبہ واستیلاء کے لیے کی جانے والی تمام کاوشیں اور کوششیں جہاد فی سبیل اللہ سے عبارت ہیں۔ اسلام نے اصولی طور پر مختلف حالات کے لیے اس کی مختلف شکلوں کا تعین کیا ہے۔ یہ قسمیں تین ہیں: داخلی جہاد' دعوتی وفکری جہاد اور مسلح جہاد۔ ایک مسلم معاشرے میں جو برائیاں سر اٹھاتی ہیں وہ شہادت اسلام کی راہ میں خطرناک رکاوٹ ہیں' انہیں کچلنا اور بیخ وبن سے اکھاڑنا نہایت ضروری ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَہُ اللّٰہُ فِیْ اُمَّۃٍ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَـہٗ مِنْ اُمَّتِہٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ' یَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِہٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِہٖ' ثُمَّ اِنَّھَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِھِمْ خُلُوْفٌ یَـقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَا لَا یُؤْمَرُوْنَ . فَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِیَدِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِلِسَانِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِقَلْبِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ' وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ)) (صحیح مسلم)

''مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ نے مبعوث کیا تھا اس کو اپنی اُمت میں ایسے مخلص پیرو اور ساتھی ضرور ملے جو اس کے طریقے کو مضبوطی سے اختیار کیے رہتے اور اس کے احکام کا اتباع کرتے' پھر ان کے بعد ان کی جگہ ایسے ناخلف آ جاتے جن کا حال یہ ہوتا کہ کہتے وہ جس پر عمل نہ کرتے اور کرتے وہ جس کی انہیں ہدایت نہ ہوتی۔ پس جس نے ان کے خلاف اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے۔ اس کے بعد

رائی کے برابر بھی ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہوتا۔''

مسلم معاشرے کو برائیوں سے پاک کرتے رہنے کی یہی تین شکلیں ممکن ہیں۔ ان میں کی ہر شکل جہاد ہے۔ جن کوششوں کو اس حدیث میں جہاد کہا گیا ہے بعض احادیث میں تغییر منکر بھی کہا گیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ' وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ))(مسلم)

''تم میں سے جس کسی شخص کو کوئی برائی نظر آئے تو چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے' اور اگر ایسا نہ کرسکتا ہو تو اس کے لیے اپنی زبان سے کام لے' اور اگر اس کی بھی جرأت نہ رکھتا ہو تو یہ کوشش اپنے دل سے کرے' اور یہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے''۔

سورۂ لقمان میں فرمایا گیا:

﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾(لقمان:۱۷)

''بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو''۔

معلوم ہوا کہ یہ جہاد اُمت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ اس سے نہ تو افراد بریٔ الذمہ ہیں اور نہ ریاست' اپنی اپنی حیثیت میں اس ذمہ داری میں سبھی شریک ہیں۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُہُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ۘ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْہَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ (التوبۃ:۷۱)

''مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے رہیں''۔

اسلامی ریاست پر بھی اس فریضہ کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰہُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَہَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾﴾ (الحج)

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخش دیں تو نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' بھلائی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے''۔

گویا ایک مسلمان انفرادی طور پر بھی اس بات کا پابند ہے کہ برائیوں کے نشوو ارتقاء میں سدّ راہ بنے اور اگر اقتدار میں ہو تو بھی منکرات کے مٹانے کا فرض نبھائے۔ یہ کام اربابِ اقتدار کے

بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْکَرِ اَوْ لَیُوْشِکَنَّ اللّٰہُ اَنْ یَبْعَثَ عَلَیْکُمْ عِقَابًا مِنْہُ ثُمَّ تَدْعُوْنَہٗ فَلَا یُسْتَجَابُ لَکُمْ)) (ترمذی' ابن ماجه)

''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! تم ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو' ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سب پر اپنا عذاب بھیج دے' اُس وقت تم خدا تعالیٰ سے دعا مانگو گے تو قبول نہ ہوگی''۔

جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مسلمانوں سے چھوٹ جائے تو ایسے میں انہیں تباہی کے گڑھے میں گرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اگر آدمی اپنے طور پر نیکی کرتا رہے' لیکن کسی کی برائی اسے اضطراب سے دوچار نہ کرے اور نہ اس کا ماتھا شکن آلود ہو اور وہ خاموش تماشائی بنا رہے تو وہ اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ اصحابِ سبت کی طرح وہ اللہ کے عذاب میں مبتلا ہو کر رہتا ہے' اس لیے کہ برائی دیکھ کر خاموش رہنا بھی ایک برائی ہے۔ اپنی حد استطاعت تک اصلاح اور اقامت حق کے لیے کوشاں رہنا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْکُمْ خَاصَّةً﴾ (الانفال:۲۵)

''ڈرو اُس فتنہ سے جس کے وبال میں خصوصیت کے ساتھ صرف وہی لوگ گرفتار نہیں ہوں گے جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو''۔

اس آیۂ کریمہ کی تشریح میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ''اللہ عزوجل خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا جب تک عامة الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے برے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہارِ ناراضی پر قادر ہوں اور پھر کوئی اظہار ناراضی نہ کریں' پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے''۔ (تزکیۂ زندگی' مرتبہ اجمل فاروق ندوی)

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: ((کَیْفَ بِکُمْ اِذَا طَغٰی نِسَاءُ کُمْ وَفَسَقَ شُبَّانُکُمْ وَتَرَکْتُمْ جِهَادَکُمْ)) ''تمہاری حالت اس وقت کیا ہوگی جب تمہاری عورتیں تم سے بے قابو ہو جائیں گی' نوجوان لڑکے

لڑکیاں آوارہ ہو جائیں گے اور تم اپنا جہاد چھوڑ دو گے۔ (تمہارے اندر سے اصلاح کا جذبہ ختم ہو جائے گا۔ تم ان برائیوں کو دیکھو گے لیکن ان کو روکنے کی کوئی تڑپ تمہارے اندر نہیں ہو گی)''۔ اس پر صحابہؓ نے حیران ہو کر پوچھا کہ: وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَائِنٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ اے اللہ کے رسول! کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟'' حضور ﷺ نے فرمایا: ((نَعَمْ، وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ وَاَشَدُّ مِنْہُ سَیَکُوْنُ)) ''ہاں، اور اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! اس سے بھی زیادہ سخت وقت آئے گا۔'' صحابہؓ نے مزید حیران ہو کر پوچھا: وَمَا اَشَدُّ مِنْہُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ ''یارسول اللہ! اس سے بھی زیادہ سخت بات اگر ہے تو وہ کون سی ہے؟'' فرمایا: ((کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَا لَمْ تَأْمُرُوْا بِمَعْرُوْفٍ وَلَمْ تَنْھَوْا عَنْ مُنْکَرٍ)) ''اُس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم بھلائی کا حکم نہیں دو گے اور برائی سے منع نہیں کرو گے؟'' صحابہؓ نے گھبرا کر دریافت کیا: وَکَائِنٌ ذٰلِکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ اے اللہ کے رسولؐ! کیا یہ بھی ہونے والا ہے؟'' آپؐ نے فرمایا: ((نَعَمْ، وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ وَاَشَدُّ مِنْہُ سَیَکُوْنُ)) ''ہاں، اور اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اس سے بھی زیادہ سخت معاملہ ہوگا''۔ صحابہؓ نے دریافت کیا: وَمَا اَشَدُّ مِنْہُ؟ ''اس سے زیادہ سخت معاملہ کیا ہوگا؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَا رَأَیْتُمُ الْمَعْرُوْفَ مُنْکَرًا وَالْمُنْکَرَ مَعْرُوْفًا)) ''اُس وقت تمہارا کیا حال ہو جائے گا کہ بھلائیاں تمہارے ہاں برائیوں میں تبدیل ہو جائیں گی اور برائیاں بھلائیاں بن جائیں گی؟'' صحابہؓ نے تحیر انگیز انداز میں پوچھا: وَکَائِنٌ ذٰلِکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ کیا ایسا بھی ہو جائے گا اے اللہ کے رسول؟'' تو آپ ﷺ نے پھر فرمایا: ((نَعَمْ، وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ وَاَشَدُّ مِنْہُ سَیَکُوْنُ......)) ''ہاں، اور اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! اس سے بھی زیادہ سخت وقت آئے گا......'' (تخریج الاحیاء للعراقی)

آج پوری مسلم دنیا جس ذلت و نکبت اور پستی سے دوچار ہے اس پر ہر دل دردمند افسردہ اور بے چین و مضطرب ہے۔ ہر سو برائیوں کے طوفان اُمڈ رہے ہیں، فحاشی و عریانی اور بے حیائی کا ایک سیلاب بلاخیز ہے جو تھمنے میں نہیں آ رہا۔ ریڈیو، ٹی وی، اخبارات، جرائد و رسائل اور میڈیا کے تمام تر جدید ذرائع یہود و ہنود اور فکر مغرب کے مبلغ اور پرچارک بنے ہوئے ہیں، اسلام کی تابندہ تاریخ اور اسلامی اقدار و روایات کا مضحکہ اڑایا جا رہا ہے، دہشت گردی کے نام پر اسلام کے تصورِ جہاد کو مسخ کرنے کی سعی کی جا رہی ہے، دینِ حق کی اقامت کے لیے کی جانے

والی کوششوں کو سبوتاژ کرنے والی قوتیں اپنی مذموم مساعی میں سرگرم عمل ہیں۔ جدت پسند ذہن عقل نارسا کی آڑ میں نئے نئے شگوفے کھلا رہا ہے۔ اجتہاد کے نام پر نصوصِ قرآنیہ کی تعبیرِ نو سے مسلمانوں کو کنفیوژن میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ گویا حدیث مبارکہ کے مضمون اور حالات میں ایک مکمل مماثلت موجود ہے۔

اس روح فرسا اور دگرگوں صورت حال سے چھٹکارا پانے کے لیے ضروری ہے کہ نہایت مؤثر انداز میں ''**اعتصام بحبل اللہ**'' کا انتظام و انصرام کیا جائے اور افرادِ ملت کا رابطہ قرآن حکیم اور سنت نبی کریم ﷺ سے استوار کرنے کی منظّم کوششیں بروئے کار لائی جائیں۔ اسلام کے داعی ان پریشان کن حالات کا ادراک کرتے ہوئے حکمت بالغہ کا ثبوت دیں۔ اسلام کے یہ مبلغ جب تک تمام تر تعصّبات سے دستکش نہیں ہوں گے اور اپنے فروعی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ایمان کے بنیادی تقاضوں کی تکمیل کے لیے یکجا نہیں ہوں گے، دین کی اقامت، حق کی شہادت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ادارے کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا اور نہ ہی مسلمان ذلت و رسوائی سے نجات پا کر اپنا تشخص برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

اخذ واستفادہ: (۱) تفہیم القرآن، جلد اول، دوم (۲) تدبر قرآن، جلد دوم (۳) الفرقان، از شیخ عمر فاروق (۴) معارف القرآن، جلد دوم (۵) ضیاء القرآن، جلد اوّل (۶) تزکیۂ زندگی (از مولانا نثار احمدؒ) (۷) اسلام ایک نظر میں (از صدر الدین اصلاحی) (۸) تفسیر عثمانی

سورۂ آل عمران کی متذکرہ بالا آیات (۱۰۲ تا ۱۰۴) کے باہمی ربط اور ان کی تشریح و وضاحت کو سمجھنے کے لیے ملاحظہ کیجیے:

اُمت مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل
اور
نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت

از: **ڈاکٹر اسرار احمد**

☆ صفحات 152 ☆ قیمت اشاعت خاص: 100 روپے، اشاعت عام: 45 روپے

عجلت پسندی ......ایک بشری کمزوری

انجینئر نوید احمد☆

الحمد للہ! احیائے دین کی تحریکوں میں شامل اکثر ساتھی ایسے ہوتے ہیں جنہیں رائج الوقت باطل نظام سے شدید نفرت ہوتی ہے۔ وہ خواہش رکھتے ہیں کہ جلد از جلد اللہ کی بغاوت پر مبنی نظام تباہ و برباد ہو اور ایسا نظام غالب ہو جس میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بڑائی نافذ و جاری ہو۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد بے حد طویل اور بڑے صبر آزما مراحل پر مشتمل ہوتی ہے۔ اِن مراحل کے دوران بعض ساتھیوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور وہ فوری طور پر کسی خوشگوار تبدیلی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اُن کی یہ خواہش ایسے میں اور شدت اختیار کر جاتی ہے جب معاشرے میں ظالمانہ نظام کے تحت اللہ کی نافرمانیاں‘ لوٹ کھسوٹ اور ظلم وستم آخری حدوں کو چھونے لگے۔ یہ صورتِ حال پاکستان میں اِس کے قیام ہی سے پیدا ہونا شروع ہوئی اور مشرف حکومت کے دور میں انتہائی شدت اختیار کر گئی۔ مشرف حکومت نے بے حیائی و بے ہودگی‘ لوٹ مار اور ظلم وستم کو سرکاری سرپرستی میں فروغ دیا اور جولائی ۲۰۰۷ء میں لال مسجد کے خلاف بہیمانہ آپریشن کر کے اپنے سیاہ کارناموں کو سنگدلی وسفاکی کی انتہا تک پہنچا دیا۔ ایسے میں احیائے دین کی تحریکوں میں سرگرمِ عمل بعض ساتھی پکار اُٹھے کہ آخر کب تک ہم دعوت اور تربیت ہی کا کام کرتے رہیں گے؟ ظلم دندنا رہا ہے اور ہم صرف وعظ ونصیحت اور درس وتدریس کر رہے ہیں۔ بقول شاعر: ؎

خوشبوؤں کا اِک نگر آباد ہونا چاہیے
اِس نظامِ زر کو اب برباد ہونا چاہیے
ظلم بچے جَن رہا ہے کوچہ و بازار میں
عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہیے

آیئے! قرآنِ حکیم کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ وہ ساتھیوں کی ایسی کیفیات کے لیے

☆ اکیڈمک ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی کراچی

کیا رہنمائی عطا فرماتا ہے:

(۱) جہاں تک عجلت پسندی یعنی محنتوں کے فوری نتائج دیکھنے کی خواہش کا معاملہ ہے تو قرآنِ حکیم اِسے ایک بشری کمزوری قرار دیتا ہے اور بار بار بیان کرتا ہے کہ یہ کمزوری انسان کی تخلیق میں رکھ دی گئی ہے:

﴿خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ سَاُورِیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ﴿۳۷﴾﴾ (الانبیاء)

''انسان کو بنایا گیا ہے جلدی سے، میں عنقریب تم کو اپنی نشانیاں دکھاؤں گا، پس تم جلدی نہ مچاؤ''۔

﴿وَیَدۡعُ الۡاِنۡسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَہٗ بِالۡخَیۡرِ ؕ وَکَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا ﴿۱۱﴾﴾

(بنی اسراء یل)

''اور انسان مانگ بیٹھتا ہے شر، جبکہ اُس کی دعا ہوتی ہے خیر کے لیے۔ اور یقیناً انسان بڑا جلد باز ہے''۔

﴿کَلَّا بَلۡ تُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ ﴿۲۰﴾﴾ (القیٰمۃ)

''ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ محبت کرتے ہو جلدی حاصل ہونے والی شے سے''۔

(۲) قرآنِ حکیم اِس حقیقت سے بھی ہمیں آگاہ فرماتا ہے کہ غلبۂ دین کے لیے انقلابی جدوجہد کرنے والوں میں بھی عجلت پسندی موجود ہوتی ہے:

﴿فَلَا تَعۡجَلۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَہُمۡ عَدًّا ﴿۸۴﴾﴾ (مریم)

''پس (اے نبی ﷺ!) ان کے لیے جلدی نہ کیجیے، ہم اُن کے لیے گنتی کر رہے ہیں پوری پوری''۔

﴿قُلۡ لَّوۡ اَنَّ عِنۡدِیۡ مَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِہٖ لَقُضِیَ الۡاَمۡرُ بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۸﴾﴾ (الانعام)

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہیے اگر میرے اختیار میں ہو وہ کہ جس کے بارے میں تم جلدی مچا رہے ہو تو معاملہ چکا دیا جائے میرے تمہارے درمیان، اور اللہ تبارک وتعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے''۔

﴿وَاُخۡرٰی تُحِبُّوۡنَہَا ؕ نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتۡحٌ قَرِیۡبٌ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۳﴾﴾

(الصف)

''ایک دوسری کامیابی ہے کہ جس کو تم پسند کرتے ہو' اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مدد آئے اور قریبی فتح حاصل ہو۔ (اے نبی ﷺ!) آپ اِس کی بھی بشارت دے دیجیے مؤمنوں کو''۔

عجلت پسندی کے حوالے سے بخاری' ابوداؤد اور نسائی میں مکی دور کے پانچویں سال کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ :

عَنْ خَبَّابِ بْنِ الْأَرَتِّ اَتَیْنَا رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ وَھُوَ مُتَوَسِّدٌ بُرْدَۃً فی ظِلِّ الْکَعْبَۃِ فَشَکَوْنَا اِلَیْہِ فَقُلْنَا: ألاَ تَسْتَنْصِرُ لَنَا' ألاَ تَدْعُو اللّٰہَ لَنَا؟ فَجَلَسَ مُحْمَرًّا وَجْھُہُ فقالَ: ((قَدْ کَانَ مَنْ قَبْلَکُمْ یُؤْخَذُ الرَّجُلُ فَیُحْفَرُ لَہُ فِی الأَرْضِ ثُمّ یُؤْتَی بِالْمِنْشَارِ فَیُجْعَلُ عَلٰی رَأْسِہٖ فَیُجْعَلُ فِرْقَتَیْنِ ما یَصْرِفُہُ ذٰلِکَ عن دِینِہٖ' وَیُمْشَطُ بِأَمْشَاطِ الْحَدِیدِ مَا دُونَ عَظْمِہٖ مِنْ لَحْمٍ وَعَصَبٍ ما یَصْرِفُہُ ذٰلِکَ عَنْ دِینِہٖ' وَاللّٰہِ لَیُتِمَّنَّ اللّٰہُ ھٰذَا الأَمْرَ حَتی یَسِیرَ الرّاکِبُ مَا بَیْنَ صَنْعَاءَ وَحَضْرَ مُوْتَ ما یَخَافُ اِلَّا اللّٰہَ تَعالٰی وَالذِّئْبَ عَلٰی غَنَمِہٖ وَلٰکِنَّکُمْ تَعْجَلُونَ))

حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' بیان کرتے ہیں کہ (جب مصائب ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئے تو) ہم اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے' جبکہ آپ ﷺ اُس وقت کعبہ کے سائے میں اپنی چادر کا ایک تکیہ سا بنائے ہوئے اِستراحت فرما رہے تھے' پھر ہم نے آپؐ سے شکوہ کیا کہ کیا آپؐ ہمارے لیے اللہ سے مدد نہ مانگیں گے اور دعا نہ کریں گے؟ اِس پر نبی ﷺ اُٹھ کر بیٹھ گئے' آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے ایک شخص کو زمین میں گڑھا کھود کر بٹھایا جاتا اور اُس کے سر پر آرا چلا کر اُس کے دو ٹکڑے کر دیے جاتے' لیکن یہ عمل اُسے راہِ حق سے ہٹا نہ سکتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوہے کی کنگھیوں سے کسی کی ہڈیوں پر سے گوشت کھرچ ڈالا جاتا لیکن دین سے اُسے دور نہ کیا جا سکتا۔ خدا کی قسم' یہ کام پورا ہو کر رہے گا یہاں تک کہ ایک شخص صنعاء سے حضرموت تک بے کھٹکے سفر کرے گا لیکن اسے کوئی خوف دامن گیر نہ ہو گا سوائے اللہ تعالیٰ کے یا اپنی بکریوں کے معاملے میں بھیڑیے کے۔ لیکن تم لوگ جلدی کر رہے ہو''۔

(۳) قرآنِ حکیم میں بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کو عجلت پسندی پر قابو

پانے اور صبر کرنے کی تلقین کی جاتی رہی :

﴿وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِئ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾﴾ (الانعام)

''(اے نبی ﷺ!) آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا، تو انھوں نے صبر کیا تھا اس جھٹلانے پر، اور رسولوں کو ایذاء دی گئی، یہاں تک کہ اُن تک ہماری مدد آ گئی، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو بدلنے والا کوئی نہیں، اور (اے نبی ﷺ!) آپ تک رسولوں کی خبریں آ چکی ہیں۔''

﴿اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿۱۵﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿۱۶﴾ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿۱۷﴾﴾ (الطارق)

''بے شک وہ چال چل رہے ہیں، اور میں بھی ایک تدبیر کر رہا ہوں، پس (اے نبی ﷺ!) مہلت دیجیے کافروں کو، آپ اُنہیں مہلت دیجیے چند دنوں کی''۔

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾﴾ (الجاثیة)

''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے اُن لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں کہ وہ درگزر کریں اُن لوگوں سے جو کہ اللہ کے (عذاب کے) دِنوں کی امید نہیں رکھتے، تاکہ اللہ تعالیٰ جزا دے کسی قوم کو بسبب اس کے جو کچھ کہ وہ کماتی رہی''۔

(۴) قرآنِ حکیم نے واشگاف الفاظ میں یہ حقیقت اہلِ ایمان پر واضح فرما دی کہ ظلم وستم کرنے والوں کے خلاف اللہ کی مدد اُن ہی لوگوں کے حق میں آئے گی جو پامردی اور ثابت قدمی کا ثبوت دے دیں :

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾﴾ (البقرة)

''اے ایمان والو! مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ

مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ ﴿۲۱۴﴾ (البقرۃ)

''(اے مسلمانو!) کیا تم نے یہ گمان کیا تھا کہ جنت میں (آسانی سے) داخل ہو جاؤ گے' حالانکہ ابھی تو تم پر وہ حالات وارد ہی نہیں ہوئے جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر آئے تھے۔ اُن پر سختیاں اور تکالیف آئیں اور وہ ہلا ڈالے گئے' یہاں تک کہ پکار اٹھے رسول اور اُن کے ساتھی اہلِ ایمان کہ کب آئے گی اللہ کی مدد؟ (اُس وقت اُنہیں بتایا گیا کہ) آگاہ رہو' اللہ کی مدد قریب ہے''۔

﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَيَعۡلَمَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۴۲﴾ (آلِ عمران)

''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ (بے آزمائش) جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی تو اللہ نے ظاہر ہی نہیں کیا کہ تم میں سے کون جہاد کرنے والے ہیں اور کون صبر کرنے (ڈٹ جانے) والے ہیں''۔

﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَكُوۡا وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَلَمۡ يَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوۡلِهٖ وَلَا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَلِيۡجَةً ؕ﴾ (التوبۃ: ۱۶)

''کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ یونہی چھوڑ دیے جاؤ گے اور ابھی تو اللہ نے ایسے لوگوں کو ظاہر کیا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا اور اللہ اور اُس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی کو دِلی دوست نہیں بنایا''۔

﴿وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ حَتّٰى نَعۡلَمَ الۡمُجٰهِدِيۡنَ مِنۡكُمۡ وَالصّٰبِرِيۡنَ ۙ وَنَبۡلُوَا اَخۡبَارَكُمۡ ﴿۳۱﴾ (محمّد)

''اور ہم تمہیں آزما کر رہیں گے یہاں تک کہ ظاہر کر دیں گے تم میں سے جہاد اور صبر کرنے (ڈٹ جانے) والوں کو اور ہم جانچیں گے تمہارے حالات''۔

بانیٔ تنظیمِ اسلامی محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ تعالیٰ نے ۱۹۶۷ء میں جب اپنے طور پر احیائے دین کے مشن کے آغاز کا ارادہ فرمایا تو ''اسلام کی نشأۃ ثانیہ...... کرنے کا اصل کام'' کے عنوان سے ایک تحریر لکھی۔ اِس تحریر میں موصوف نے بیسویں صدی کی احیائی تحریکوں کے دنیا میں کامیاب نہ ہونے کا ایک سبب عجلت پسندی تشخیص کیا :

''ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی معتد بہ تعداد کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا جس کے نتیجے میں قومی قیادتوں اور ترقی پسند عناصر سے قبل از وقت تصادم کی نوبت آ گئی' لیکن درحقیقت اُن کی ناکامی براہِ راست نتیجہ ہے ان کے تصورِ دین کی خامی اور مطالعۂ اسلام کے نقص کا''۔

(اسلام کی نشأۃ ثانیہ ...... کرنے کا اصل کام' صفحہ ۱۳)

تحریر کے مندرجہ بالا اقتباس میں اشارہ ہے جماعتِ اسلامی کے انتخابی سیاست میں داخل ہونے کی طرف' جس کی وجہ سے اُس کا قومی قیادت یعنی مسلم لیگ سے قبل از وقت تصادم ہوگیا۔ دوسرا اشارہ مصر کی الاخوان المسلمون کی طرف ہے جس نے قضیۂ فلسطین میں اپنے کارکنوں کو اسرائیل کے خلاف عسکری کارروائیوں کے لیے میدان میں اتار دیا اور مصر کی ترقی پسند قیادت نے اِس عسکری رجحان کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھا اور الاخوان کی قوت کو کچل کر رکھ دیا۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جب ۱۹۷۴ء میں تنظیم اسلامی قائم کرنے کا اعلان کیا تو ایک تحریر ''موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ اور تنظیمِ اسلامی کا محل و مقام'' کے عنوان سے رقم کی۔ اِس تحریر میں موصوف نے احیائی عمل کے حوالے سے بعض اہم نکات کی طرف اشارہ اِن الفاظ میں کیا :

''اِس احیائی عمل کے بارے میں بھی بعض بنیادی حقائق ذہن نشین رہنے چاہئیں۔ مثلاً ایک یہ کہ یہ کوئی سادہ اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اِس کے متعدد گوشے ہیں جن میں سے ہر ایک میں اولوا العزم افراد اور جماعتیں برسرِ پیکار ہیں اور جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اِس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لیے باعثِ تقویت ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور ملت اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں مکمل ہونے والا نہیں ہے بلکہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ کے مصداق درجہ بدرجہ بہت سے مراتب و مراحل سے گزر کر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا' لہٰذا اِس ارتقائی عمل کا ہر درجہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور چاہے بعد کے مراحل سے گزر کر پہلوں کا کام بہت حقیر بلکہ کسی قدر غلط بھی نظر آئے اپنے اپنے دور کے اعتبار سے اِس کی اہمیت و وقعت سے بالکلیہ انکار ممکن نہیں۔ تیسرے یہ کہ اِس ہمہ گیر تجدیدی جدوجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم

ہے تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہو جاتی ہیں' اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اِس وسیع احیائی عمل کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہیں جو ان سب کو محیط ہے۔

ماضی میں اِن حقائق کے پیش نظر نہ رہنے کے باعث بہت سے لوگوں کے دلوں میں ''مہدیٔ موعود'' یا ''مجددِ کامل'' بننے کا شوق پیدا ہوتا رہا ہے جس کے نتیجے میں طرح طرح کے فتنے اُٹھتے رہے ہیں اور اچھی بھلی تعمیری کوششوں کا رُخ تخریب کی جانب مڑ جاتا رہا ہے''۔ (تنظیمِ اسلامی کا تاریخی پس منظر' صفحہ ۲۷۔۲۸)

الاخوان المسلمون کے اہم ترین فکری رہنما سید قطب شہیدؒ اپنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کے مقدمہ میں عجلت پسندی کے حوالے سے بڑا حکیمانہ تجزیہ کرتے ہیں :

''اللہ تعالیٰ نے اِس کائنات کو اندھے اور بہرے مشینی قوانین کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ ان قوانینِ فطرت کے پیچھے ایک مدبر ارادہ ہے اور ایک مطلق مشیت ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ میں نے یہ بات اچھی طرح جان لی کہ اللہ کی قدرت برابر کام کر رہی ہے۔ لیکن اِس کے کام کا ایک خاص طریقہ ہے اور ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم کسی کام میں جلد بازی کریں یا اللہ کی بارگاہ میں تجاویز بھیجتے پھریں' کیوں کہ اسلامی نظامِ زندگی —— جیسا کہ قرآن کے گہرے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے —— بنایا ہی اِس لیے گیا ہے کہ وہ ہر معاشرے میں چلے۔ انسانی ترقی کے ہر مرحلے میں اور بنی نوع انسان کے ذہنی ارتقاء کے مختلف حالات میں سے ہر حال میں رائج و نافذ ہو۔ یہ نظامِ زندگی اُس آدمی کے لیے بنایا گیا ہے جو اِس کرۂ ارض پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ اِس نظام میں اُس آدمی کی فطرت' اُس کی قوتوں' اُس کی قابلیتوں' اُس کے حالات' اُس کی کمزوریوں اور ہر لمحہ بدلنے والے حالات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ یہ نظام انسانوں کے بارے میں کوئی بری رائے نہیں رکھتا کہ اس کرۂ ارض پر اُن کی کوئی حیثیت اور وقعت ہی نہ ہو۔ آدمی مختلف شکلوں اور صورتوں کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں' بحیثیت ایک فرد بھی بحیثیت ایک جماعت بھی۔ اور یہ نظامِ زندگی کی کسی ظاہری شکل کو حقیر نہیں سمجھتا۔ اِسی طرح یہ نظام محض خیالی باتوں کے درپے نہیں ہوتا اور انسان کو اُس کی حقیقی قدر و منزلت' اُس کی طاقت اور قابلیت اور اُس کے مقصدِ وجود سے زیادہ بلند بھی نہیں کرتا' جس کے لیے

اُسے روزِ اوّل سے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ نظام دونوں حالتوں میں یہ فرض نہیں کرتا کہ فطرتِ انسانی کے بنیادی عناصر کوئی سطحی چیز ہیں اور اُنہیں کسی قانون کے ذریعے تخلیق کیا جاسکتا ہے یا محض قلم کاری کے بل بوتے پر انسان کو اپنی فطرتِ سلیمہ سے معراء کیا جاسکتا ہے' بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ انسان اپنی فطرت' اپنے میلانات اور اپنی قابلیت کے نقطۂ نظر سے اپنی اِسی مخصوص شکل میں ایک مستقل ''حقیقت'' ہے اور اسلامی نظامِ زندگی صرف اُس کی رہنمائی کر کے اُسے ان بلند درجات تک پہنچانا چاہتا ہے جو اُس کے لیے' اُس کے مقصدِ تخلیق اور اُس کی ذمہ داریوں کے نقطۂ نظر سے مقرر ہیں۔ یہ نظام آدمی کی ذات' اُس کی فطرت اور اُس کے بنیادی عناصر ترکیبی کا احترام کرتے ہوئے اُسے اُس راہ پر چلاتا ہے جو سیدھی ذاتِ باری تک جا پہنچتی ہے —— غرض اسلامی نظامِ زندگی ایک طویل زمانے کے لیے بنایا گیا ہے جس کی طوالت کا صحیح اندازہ اُس انسان کے خالق اور اُس قرآن کے نازل کرنے والے ہی کے پاس ہے۔ اِس لیے' اپنے بلند مقاصد کے حصول کے لیے یہ نظام نہ تو بے راہ روی اختیار کرتا ہے نہ جلد بازی سے کام لیتا ہے۔ اِس کے سامنے ایک طویل عرصۂ حیات اور ایک وسیع میدانِ کار ہے۔ ایک فرد کی عمر اُسے محدود نہیں کر سکتی' نہ ہی کسی فنا ہونے والے کی یہ خواہش اور ڈر کہ اپنے انتہائی مقصد تک پہنچنے سے قبل ہی کہیں اُس کا سر رشتۂ حیات ٹوٹ نہ جائے' اسے اپنی فطری رفتار سے تیز کر سکتا ہے۔

عام طور پر دنیاوی نظریات و مذاہب کے حاملین کا حال ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ تمام کام کو ایک ہی نسل میں کر گزرنا چاہتے ہیں۔ اِس طرح وہ فطرت کے متوازن طریق کار سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ایک متوازن اور صبر آزما طریق کار کے مطابق کام کرنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں رکھتے۔ اور وہ جو راہ اختیار کرتے ہیں' اُس میں قتل و غارت ہوتی ہے' خونِ ناحق ہوتا ہے' اعلیٰ اقدار پامال ہوتی ہیں اور زندگی کے پر سکون معاملات میں ایک شدید اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت سے ٹکرا کر ایسے لوگ خود بھی پاش پاش ہو جاتے ہیں اور جب اُن کے مصنوعی نظریات فطرتِ سلیمہ کی زد میں آتے ہیں تو اُن کا نام و نشان ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے' کیوں کہ فطرت کے مقابلے میں ناپختہ نظریات کبھی نہیں ٹھہر سکتے۔

اِس کے مقابلے میں اسلامی نظامِ زندگی نہایت دھیمی رفتار سے' فطرت کے ساتھ ساتھ

چلتا ہے۔ بعض مواقع پر وہ فطرت کو آگے بڑھاتا ہے' بعض جگہ وہ اِسے پیچھے ہٹاتا ہے۔ اگر اِس میں کجی آجائے تو اُسے سیدھا کر دیتا ہے' وہ اُس میں توڑ پھوڑ کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک صاحبِ بصیرت اور صاحبِ حکمت انسان کی طرح صبر کرتا ہے' جسے منزلِ مقصود تک پہنچ جانے کا وثوق ہوتا ہے اور جسے یقین ہوتا ہے کہ جو کام اِس کوشش میں نہیں ہو پاسکا وہ دوسری میں ہوجائے گا ورنہ تیسری میں' ورنہ دسویں میں' ورنہ سویں میں' ورنہ ایک ہزارویں میں تو ہوکے رہے گا۔ کیوں کہ زمانہ طویل ہے' مقصد واضح ہے اور اعلیٰ مقصد تک پہنچنے کے لیے راہ دُور ہے۔ اِس کی مثال یہ ہے کہ ایک پودا اُگتا ہے' اُس کی جڑیں زمین میں گہری ہوتی چلی جاتی ہیں اور پھر اُس کی شاخیں فضا میں دور دور تک پھیل جاتی ہیں اور وہ ایک دوسرے سے پیوستہ ہوتی ہیں اور اُسی میں اُن کے لیے امیدِ بہار ہوتی ہے۔ بعینہٖ اِسی طرح اسلامی نظامِ حیات کا پودا دلوں میں اگتا ہے۔ دھیرے دھیرے وہ بلند ہوتا ہے اور اِس کے بعد زمین پر ہوتا وہی کچھ ہے جس کے بارے میں اللہ کے ہاں فیصلہ ہوچکا ہوتا ہے کہ ہوجائے۔ دیکھئے کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ فصل ریت میں دب جاتی ہے' کبھی اُسے ٹڈی دل چاٹ جاتا ہے' کبھی خشک سالی اُسے تباہ کردیتی ہے' کبھی سیلاب اُسے بہا کر لے جاتا ہے لیکن ایک صاحبِ بصیرت کسان اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ فصل اپنی جڑ کے لحاظ سے باقی ہے' اُسے کامل ہونا ہے اور بالآخر ایک عرصہ بعد وہ اُن سب آفات پر غالب آجاتی ہے۔ لیکن اِن سب حالات کے باوجود کسان جلد بازی نہیں کرتا' پریشان نہیں ہوتا اور فطرت کے متوازن اور تدریجی خوشگوار اور پیارے طریق کار کے علاوہ کسی اور مصنوعی طریق سے وہ اِس فصل کو پکانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ یہی ہے اسلامی انقلاب کا ربانی طریقِ کار جو اِس پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ یہی سنت اللہ ہے اور ظاہر ہے کہ سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيْلاً''۔

بانیٔ جماعتِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سورۃ الانعام کی آیت ۳۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

''یعنی اللہ نے حق اور باطل کی کش مکش کے لیے جو قانون بنا دیا ہے اِسے تبدیل کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ حق پرستوں کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ایک طویل مدت تک آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں۔ اپنے صبر کا' اپنی راستبازی کا' اپنے ایثار اور اپنی

طرف داری کا' اپنے ایمان کی پختگی اور اپنے توکل علی اللہ کا امتحان دیں۔ مصائب اور مشکلات کے دَور سے گزر کر اپنے اندر وہ صفات پرورش کریں جو صرف اِسی دشوار گزار گھاٹی میں پرورش پا سکتی ہیں اور ابتداءً خالص اخلاقِ فاضلہ وسیرتِ صالحہ کے ہتھیاروں سے جاہلیت پر فتح حاصل کر کے دکھائیں۔ اِس طرح جب وہ اپنا اصلح ہونا ثابت کر دیں گے تب اللہ کی نصرت ٹھیک اپنے وقت پر اُن کی دستگیری کے لیے آ پہنچے گی۔ وقت سے پہلے وہ کسی کے لائے نہیں آ سکتی''۔

کیا کیا جائے؟

بلاشبہ دینی احکامات کی پامالی' اخلاقی بگاڑ اور ظلم واستحصال کے حوالے سے صورتِ حال انتہائی دگرگوں ہے۔ اِس صورتِ حال میں اللہ کے احکامات کے حوالے سے بغاوت پر خون کا کھولنا ایمان کی علامت ہے۔ البتہ جوش میں آ کر جلد بازی کے ذریعہ کوئی اقدام کرنا نتیجہ خیز نظر نہیں آتا۔ ظالمانہ نظام کے خلاف اقدام کے لیے اہلِ ایمان کے پاس نہ ابھی مناسب ایمانی واخلاقی قوت ہے کہ اللہ کی مدد ہمارے شاملِ حال ہو' نہ ایسے مادی وسائل ہیں جو دشمن کو مرعوب کر سکیں اور نہ ہی اِس وقت ہمارا معاشرہ مجموعی طور پر احکاماتِ شریعت قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ اِن حالات میں ہمیں صبر واستقامت کے ساتھ دو امور پر توجہات کو مرکوز کرنا چاہیے :

(ا) قرآنِ حکیم کے ذریعہ تبلیغ کا حق ادا کیا جائے اور لوگوں پر حجت تمام کی جائے۔ ہماری اکثریت کی دین سے دوری کی وجہ دین دشمنی نہیں بلکہ دین سے لاعلمی ہے۔ تنظیمِ اسلامی کی قراردادِ تاسیس کا مندرجہ ذیل حصہ خاص طور پر ہمارے پیشِ نظر رہنا چاہیے :

''اِس سلسلے میں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ ہمارے معاشرے کا مجموعی مزاج اگرچہ دین سے بہت دُور جا چکا ہے اور اِس اعتبار سے انتہائی اصلاح طلب ہے لیکن دعوت واصلاح کے عمل میں دو حقائق کا لحاظ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ یہ معاشرہ ایک مجموعی اکائی ہے اور اِس کے تمام طبقات میں انحطاط سرایت کر چکا ہے۔ اِس اعتبار سے اِس کے مختلف طبقات میں کمیّت کا تھوڑا بہت فرق چاہے موجود ہو کوئی بنیادی امتیاز موجود نہیں ہے۔ اور دوسرے یہ کہ انحطاط براہِ راست نتیجہ ہے جذباتِ ایمانی کے ضعف اور کتاب وسنت کے علم کی کمی کا۔ اِس میں دین دشمنی کا عنصر چند ایسی استثنائی

صورتوں کے سوا موجود نہیں ہے جو اگرچہ بجائے خود تو بہت خطرناک ہیں اور اُن سے خبردار رہنے کی بھی ضرورت ہے' تاہم مجموعی اعتبار سے ہمارے معاشرے کے عام بگاڑ کا اصل سبب دین دشمنی نہیں بلکہ دین سے لاعلمی ہے۔ حکومت اِس معاشرے کا جامع عکس اور اربابِ اقتدار اِس کا اہم جزو ہیں۔ اُن کو اپنی اہمیت اور معاشرے میں اثر و نفوذ کی قوت وصلاحیت کے اعتبار سے دعوت وتخاطب میں اوّلیت تو دی جاسکتی ہے اور دی جانی چاہیے لیکن اُنہیں دین کا دشمن قرار دے کر اُن کے خلاف نفرت وعداوت کے جذبات پیدا کرنے کے لیے عوام کے دینی جذبے کو مشتعل کرنا درآں حالیکہ خود عوام کی ایک عظیم اکثریت کا حال' دین سے بے خبری اور عملی بُعد کے اعتبار سے خود کم وبیش وہی ہے جو اصحابِ قوت واختیار کا' نہ اُن کی خیر خواہی ہے نہ خود دین کی''۔

(تعارفِ تنظیمِ اسلامی' صفحات ۳۱-۳۲)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۲﴾ (الفرقان)

''پس (اے نبی ﷺ!) اِن کافروں کی بات نہ مانیے اور اِن سے جہاد کیجیے اس قرآن کے ذریعے بہت بڑا جہاد''۔

نبی اکرم ﷺ نے تقریباً ۲۲ برس کے عرصہ میں انقلاب برپا فرمایا۔ اِن میں سے ۱۵ برس تک آپ ﷺ نے قرآنِ حکیم کے ذریعے جہاد کیا اور قرآن کی دعوت پہنچانے کا حق ادا کر دیا۔ دعوتِ قرآنی قبول کرنے والوں کی ذہن سازی کی اور اُن کی فکر کو پختہ کیا۔ دعوتِ قرآنی قبول نہ کرنے والوں پر حجت تمام کردی اور پھر اُن کے خلاف قتال کیا۔ کیا خوب کہا ہے اکبرالہ آبادی نے :

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے

(۲) باعمل اور منظّم رفقاء کی قابلِ لحاظ تعداد پر مشتمل حزب اللہ بنائی جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۲۰۰﴾ (آلِ عمران)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر کرو (ڈٹے رہو)' اور صبر میں آگے بڑھ جاؤ

(کافروں کے مقابلہ میں) اور (آپس میں) مربوط رہو اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچتے رہو' تاکہ تم فلاح پاؤ''۔

جب تک ہم اپنی تربیت کے ذریعے معاشرے پر حسنِ سیرت و کردار کا ایک اثر نہیں ڈالیں گے اور اپنی دیانت داری اور قول و فعل کی مطابقت کی ایک ساکھ قائم نہیں کریں گے' اللہ کی مدد ہمارے شاملِ حال نہیں ہو گی۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ۝۱۹۴﴾ (البقرۃ)

''اور جان لو کہ بے شک اللہ متقیوں کے ساتھ ہے''۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا وَّالَّذِيۡنَ هُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ۝۱۲۸﴾ (النحل)

''بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ تو اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو اللہ کی نافرمانی سے بچتے ہیں اور وہ لوگ جو نیکی کی روش اختیار کرنے والے ہیں''۔

دین کے غلبے کے لیے قربانی دینے کا جذبہ لائقِ تحسین ہے' لیکن یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ:

﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الۡمُتَّقِيۡنَ۝۲۷﴾ (المائدہ)

''بے شک اللہ قبول فرماتا ہے متقیوں کی طرف سے''۔

بقول جگر مراد آبادی:

مری طرف سے کوئی یہ کہہ دے' مجاہدِ بے خبر سے پہلے
صفائے قلب و نظر ہے لازم' جہادِ تیغ و تبر سے پہلے!

اَللّٰهُمَّ ارۡزُقۡنَا اَنۡ نُجَاهِدَ فِيۡ سَبِيۡلِكَ بِاَمۡوَالِنَا وَاَنۡفُسِنَا. آمین!

روزہ کے نتائج اور آداب

حافظ محمد مشتاق ربانی

اَلصَّوم اور اَلصِّیَام دونوں صَامَ یَصُوْمُ (ن) سے مصدر ہیں‘ جس کے معنی ’’رُک جانا‘‘ کے ہیں۔ ابومنصور الأزہری (ت ۳۷۰ھ) اپنی کتاب ’’تہذیب اللغہ‘‘ میں لکھتے ہیں:

الصوم فی اللغة الامساک عن الشیء والترک لہ(۱)

’’لغت میں الصوم سے مراد کسی کام سے رُک جانے اور باز رہنے کے ہیں۔‘‘

سورۂ مریم میں حضرت مریم علیہا السلام سے کہا گیا:

﴿فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُکَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا ﴿۲۶﴾﴾

’’پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہہ دے کہ میں نے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مانی ہے‘ اس لیے آج میں کسی سے نہ بولوں گی۔‘‘

اصطلاح میں ’’صوم‘‘ سے مراد نیت کے ساتھ صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور چند دیگر اُمور سے رُکے رہنا ہے۔ امام القرطبی اپنی تفسیر ’’الجامع لأحکام القرآن‘‘ میں روزہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

الامساک عن المفطرات مع اقتران النیة بہ من طلوع الفجر الی غروب الشمس(۲)

’’روزے کی نیت کے ساتھ طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک ہر قسم کے مفطرات سے رک جانا۔‘‘

فقہاء کرام نے **الامساک عن المفطرات** کی شرح کی ہے کہ اس سے مراد ہے **الامساک عن الاکل والشرب والجماع** یعنی کھانے پینے اور عملِ زوجیت سے باز رہنا۔

روزہ کے نتائج

یوں تو روزہ کے کئی نتائج ہیں لیکن قرآن حکیم میں روزہ کے چند اہم نتائج جو بتائے گئے ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) تقویٰ و پرہیزگاری

''تقویٰ'' اسم ہے جس کے معنی نفس کو اُن تمام چیزوں سے بچانا ہے جن سے اس کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اصطلاح میں نفس کو ہر اُس چیز سے بچانے کا نام تقویٰ ہے جو گناہ کا سبب ہو، اور یہ حرام کاموں کو ترک کرنے سے حاصل ہوتا ہے، مگر اس میں درجۂ کمال تک پہنچنے کے لیے بعض اوقات مباحات کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے۔ تقویٰ دراصل روزے کا ایک بہت بڑا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴿١٨٣﴾﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے اوپر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔''

مولانا مودودیؒ ''خطبات'' میں ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ کے تحت لکھتے ہیں:

''یہ نہیں فرمایا کہ روزہ سے تم ضرور متقی و پرہیزگار بن جاؤ گے۔ اس لیے کہ روزے کا یہ نتیجہ تو آدمی کی سمجھ بوجھ اور اس کے ارادے پر موقوف ہے۔ جو اس کے مقصد کو سمجھے گا اور اس کے ذریعہ سے اصل مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا وہ تو تھوڑا یا بہت متقی بن جائے گا، مگر جو مقصد ہی کو نہ سمجھے گا اور اسے حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کرے گا اسے کوئی فائدہ حاصل ہونے کی اُمید نہیں''۔ (۳)

(۲) تکبیرِ ربّ

تکبیر کے معنی کسی کو بڑا سمجھنے کے ہیں۔ ''تکبیرِ ربّ'' کی اصطلاح اللہ اکبر کہہ کر اللہ تعالیٰ کی عظمت کو ظاہر کرنے پر بھی بولی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی عظمت کا احساس کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا﴿١١١﴾﴾

’’اور اس کو بڑا جان کر اس کی بڑائی کرتے رہو‘‘۔سورۃ المدثر میں فرمایا:﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿۳﴾﴾ ’’اور اپنے ربّ کی بڑائی کرو‘‘۔ یہ تکبیر ربّ روزے کا ایک اہم نتیجہ ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ میں روزے کی فرضیت کا حکم دینے کے بعد فرمایا:

﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ (آیت ۱۸۵)

’’تا کہ تم اس عطائے ہدایت پر اللہ کی تکبیر وتقدیس کرو‘‘

مولانا امین احسن اصلاحی تدبر قرآن میں آیت مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

’’تکبیر سے مراد خدا کی عظمت و جلالت اور اس کی بزرگی و کبریائی کے احساس و اعتراف کی وہ حالت ہے جو ایک روزہ دار پر روزے کی حالت میں عملاً طاری ہوتی ہے اور جس کے سبب سے بندہ اپنی تمام جائز خواہشوں سے بھی محض اپنے ربّ کی رضا اور خوشنودی کی طلب میں دستبردار ہو جاتا ہے۔اس حقیقت پر مسلم کی اس حدیث سے بھی روشنی پڑتی ہے‘ جس میں فرمایا گیا ہے: ((كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ يُضَاعَفُ : الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ‘ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : اِلَّا الصَّوْمَ‘ فَاِنَّهُ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ‘ يَدَعُ شَهْوَتَهُ وَطَعَامَهُ مِنْ اَجْلِيْ)) ابن آدم کا ہر نیک عمل بڑھایا جائے گا‘ دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک‘ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صرف روزے کا معاملہ اس سے مختلف ہے‘ یہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اپنے ہاتھوں اس کا بدلہ دوں گا‘ کیونکہ بندہ صرف میری ہی خاطر اپنی خواہشوں اور اپنے کھانے کو چھوڑتا ہے‘‘۔(۵)

(۳) شکر

یہ شَكَرَ يَشْكُرُ کا مصدر ہے جس کے معنی احسان ماننا اور قدر پہچاننا کے ہیں۔ جیسا کہ الفراہیدی (ت ۱۷۵ھ) اپنی معجم ’’کتاب العین‘‘ میں اس سے مراد ’’**عرفان الاحسان**‘‘(۶) یعنی ’’احسان کو پہچاننا‘‘ لکھتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:

’’نعمت کے تصور اور اس کے اظہار کو شکر کہتے ہیں‘‘۔(۷)

یاد رہے کہ نعمت کی قدردانی کے ذرائع زبان‘ دل اور دیگر جوارح (اعضاء) ہیں۔ روزہ کے ذریعے سے جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندے میں تقویٰ و پرہیزگاری پیدا کرنا چاہتا ہے‘ اور اسے اپنی عظمت اور کبریائی کا احساس دلاتا ہے‘ اسی طرح وہ روزے کے ذریعے سے ہمارے

اندر شکر کا جذبہ بھی پیدا کرنا چاہتا ہے' جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ''تا کہ تم (اِس نزولِ خیر و برکت اور اس عطائے فرقان پر اللہ تعالیٰ کا) شکر بجالاؤ''۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''روزہ کی ایک غرض و غایت یہ بھی ہے کہ اہل ایمان اس ہدایت کی قدر و قیمت کا احساس کریں جو اللہ نے انہیں عطا کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روزے کے زمانے میں اہل ایمان ہر زمانے سے زیادہ اس ہدایت کی قدر و قیمت کو اپنے نفوس میں محسوس کرتے ہیں''۔[۸]

(۴) صبر

صبر ایک جامع اصطلاح ہے جس کے معنی کسی کو تنگی کی حالت میں روکنا کے ہیں' گویا اپنے جی کو اس طرح روکے رکھنا جس طرح عقل و شریعت متقاضی ہو۔ روزے کا ایک مقصد صبر کا خوگر بنانا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے رمضان المبارک کو ((شَهْرُ الصَّبْرِ))[۹] قرار دیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾

''اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لیا کرو' بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اس آیت میں وارد الصبر سے مراد کئی مفسرین نے ''الصوم'' لیا ہے۔ جیسا کہ محمود الآلوسی البغدادی (ت ۱۲۷۰ھ) نے ''روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع والمثانی'' میں الصبر کا ایک مفہوم ''الصوم'' لکھا ہے۔[۱۰] سفیان بن عیینہؒ کا قول ہے: ''اَلصَّوْمُ هُوَ الصَّبْرُ''[۱۱] ''روزہ ہی صبر ہے''۔

حدیث نبویؐ ہے: ((اَلصَّوْمُ لِيْ))[۱۲] ''روزہ میرے لیے ہے۔''

اسی طرح صبر کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (البقرۃ)

''بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

گویا جس طرح روزہ اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی معیت صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جس طرح روزہ کے بارے میں حدیث قدسی ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ فرما

رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

((اَنَا اَجْزِیْ بِهٖ . وفي رواية: اَنَا اُجْزٰی بِهٖ))

''میں ہی روزے کی جزا دوں گا'' یا ''میں خود ہی روزے کی جزا ہوں''۔

اسی طرح اہل صبر کے بارے میں سورۃ الزمر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴿۱۰﴾﴾

''یقیناً جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بے شمار ثواب ملے گا''۔

ان مذکورہ بالا نتائج کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

''ایسے صائم اور روزہ دار' جن کے صوم میں اتقاء' تقدیس' شکر اور صبر کے عناصر اربعہ[۱۳] نہیں وہ فاقہ کش ہیں' جن کی تشنگی اور گرسنگی ایک پھول ہے جس میں رنگ و بو نہیں' ایک گوہر ہے جس میں آب نہیں' ایک آئینہ ہے جس میں جوہر نہیں' اور ایک جسم ہے جس میں روح نہیں۔ اور کون نہیں جانتا کہ ایک گل بے رنگ و بو' ایک گوہر بے آب' ایک آئینہ بے جوہر' ایک جسم بے روح بے حقیقت ہستیاں ہیں' جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے: ((رُبَّ صَائِمٍ لَیْسَ لَهٗ مِنْ صِیَامِهٖ اِلَّا الْجُوْعُ' وَرُبَّ قَائِمٍ لَیْسَ لَهٗ مِنْ قِیَامِهٖ اِلَّا السَّهْرُ))[۱۴] یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے جسم نے روزہ رکھا' لیکن دل نے روزہ نہیں رکھا۔ ان کی زبان پیاسی تھی' لیکن دل پیاسا نہ تھا' پس رحمت کا کوثر ان کے لیے نہیں کہ پیاسے نہ تھے''۔[۱۵]

تقویٰ' تکبیر ربّ' شکر اور صبر کے علاوہ بھی روزے کے کئی نتائج ہیں۔ جیسا کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی کتاب ''المصالح العقلية للاحكام النقلية''[۱۶] میں لکھتے ہیں:

''(۱) روزہ سے انسان کی عقل کو نفس پر پورا پورا تسلط و غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ (۲) روزہ رکھنے سے انسان کی اپنی عاجزی اور خدا تعالیٰ کے جلال اور اس کی قدرت پر نظر پڑتی ہے۔ (۳) روزہ رکھنے سے چشم بصیرت کھلتی ہے۔ (۴) دور اندیشی کا خیال ترقی کرتا ہے۔ (۵) کشف حقائق الاشیاء ہوتا ہے۔ (۶) درندگی و بہیمیت سے دوری ہوتی ہے۔ (۷) ملائکہ الٰہی سے قرب حاصل ہوتا ہے۔ (۸) دل میں انسانی ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ (۹) روزہ موجب صحت جسم و روح ہے۔ (۱۰) روزہ انسان کے لیے ایک روحانی غذا ہے۔ (۱۱) روزہ محبت الٰہی کا نشان ہے''۔

روزہ کے آداب

ان سب نتائج کو حاصل کرنے کے لیے روزے کو اس کے آداب اور اس کی باطنی شرائط کے مطابق رکھنے کی ضرورت ہے' ورنہ یہ نتائج حاصل نہ ہوں گے۔ امام غزالیؒ اپنی کتاب احیاء العلوم(۱۷) میں روزے کے چھ آداب ذکر کرتے ہیں' جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:(۱۸)

(۱) نگاہ نیچی رکھنا

مرد و عورت کو اپنی نگاہ کی یوں تو ہر حالت میں حفاظت کرنی چاہیے' لیکن روزے کی حالت میں خاص طور پر انتہائی اہتمام کے ساتھ اس کی حفاظت کرنے کی ضرورت ہے۔ سورۃ النور میں فرمایا:

﴿يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾ (آیت ۳۰)

''مرد اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔''

﴿يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ﴾ (آیت ۳۱)

''عورتیں اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔''

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

((النظرة سهمٌ من سهام ابليس مسمومة فمن تركها من خوف الله اثابه اللّٰه جل وعز ايمانا يجد حلاوته فى قلبه))(۱۹)

''نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک زہر کا بجھا ہوا تیر ہے' جو کوئی اس کو خدا تعالیٰ کے خوف سے ترک کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ایسا ایمان عنایت فرمائے گا جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا''۔

(۲) زبان کی حفاظت کرنا

روزہ دار کو چاہیے کہ زبان کو جھوٹ' غیبت' چغلی اور فحش گوئی سے پاک رکھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

((اَلصِّيَامُ جُنَّـةٌ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَجْهَلْ وَاِنِ امْرُؤٌ قَاتَلَهُ اَوْ شَاتَمَهُ فَلْيَقُلْ اِنِّىْ صَائِمٌ))(۲۰)

''روزہ سپر (ڈھال) ہے۔ جب تم میں سے کوئی روزہ رکھے تو فحش اور جہالت والی

گفتگو نہ کرے۔ اور اگر اس سے کوئی لڑائی کرے یا گالی دے تو اس کو کہنا چاہیے کہ میں روزہ دار ہوں۔''

(۳) بری بات نہ سننا

اصل میں جن باتوں کے کرنے سے منع کیا گیا ہے' ان کو سننا بھی نہیں چاہیے۔ سورۃ المائدۃ میں یہود کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ﴾ (آیت ۴۲)

''جھوٹی باتیں بنانے کے لیے جاسوسی کرنے والے۔''

اسی طرح وہ لوگ جو کسی ایسی محفل میں بیٹھنا پسند کریں جس میں اللہ اور اس کے رسول کا استہزاء ہو' ان کے بارے میں سورۃ النساء میں فرمایا:

﴿اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴۰)

''تب تو بے شک تم بھی انہی کی طرح کے ہو۔''

(۴) ہاتھ' پاؤں اور دیگر اعضاء کا استعمال

روزے کی حالت میں ایک مسلمان کسی دوسرے پر ہاتھ نہ اٹھائے' اس کے قدم کسی ایسے کام کی طرف نہ بڑھیں جو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہو' اور وہ شکم کو افطار کے وقت حرام کھانے سے بچائے' کیونکہ جو شخص حرام کھائے ایسے روزہ دار کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص محل تعمیر کرے مگر پورے شہر کو منہدم کر دے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ فرمانِ نبوی ﷺ ہے:

((كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ اِلَّا الْجُوْعُ))(۲)

''کتنے ہی روزے دار ایسے ہیں جن کے لیے ان کے روزے میں سوائے بھوک کے کچھ نہیں۔''

اس حدیث کی شرح میں بعض نے کہا ہے کہ یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو روزہ حرام کھانے سے افطار کرے۔

(۵) افطار کے وقت حلال غذا بھی کم کھائے

افطار کے وقت کھانے پینے میں اگر انسان اعتدال سے کام نہ لے تو اس سے روزہ کی روح قدرے متأثر ہو گی۔ قرآن حکیم میں تو عام حالات میں بھی ضرورت سے زیادہ کھانے

سے منع کیا گیا ہے۔ سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾﴾

''کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو' بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

حکیم محمد سعید شہید اپنے مضمون ''تقلیل غذا' وسیلۂ صحت'' میں لکھتے ہیں:

''ارکان اسلام میں تیسرا اہم ترین رکن روزہ ہے جس کا سب سے بڑا مقصد تو رضائے الٰہی کا حصول ہے' طبی اور جسمانی فائدہ اس کے علاوہ ہے۔ دن بھر کی بھوک پیاس کے بعد معدہ بالکل صاف ہو جاتا ہے اور افطار کے ذریعے مادی لذتوں سے لطف اندوز ہو کر کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل ہو جاتی ہے' بشرطیکہ افطار اور رات کے کھانے میں لی جانے والی غذا مناسب وزود ہضم اور متوازن ہو۔''(۲۲)

(۶) افطار کے بعد خوف ورجا کی کیفیت طاری ہو

روزہ دار یہ امید رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے روزہ کو قبول کر لیا ہے اور ساتھ ہی اندیشہ لاحق ہو کہ شاید نہ قبول ہوا ہو' لیکن اُمید کی کیفیت کا غلبہ ہو۔

آخر میں عرض ہے کہ روزہ دراصل آزمائش کا ایک ذریعہ ہے۔ جیسا کہ امام شافعی سورۃ البقرۃ کی آیت ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ﴾ (آیت ۱۵۵) ''ہم تمہیں لازماً کسی قدر خوف اور بھوک سے آزمائیں گے'' میں ''الجوع'' سے مراد روزہ لیتے ہیں۔(۲۳) لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اس آزمائش میں ناکام ہونے سے بچیں۔ اس کے لیے ہمیں روزے کو مذکورہ بالا آداب کے ساتھ رکھنا چاہیے تاکہ ہم تقویٰ' تکبیر ربّ' شکر اور صبر جیسے فوائد اور نتائج حاصل کر سکیں۔

حواشی

(۱) ابومنصور الأزهري' تهذيب اللغة' ج ۱۲' ص ۲۵۹۔

(۲) القرطبي' الجامع لأحكام القرآن' ج ۱' ص ۳۵۲۔

(۳) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی' خطبات' ص ۱۹۸۔

(۴) صحيح مسلم' كتاب الصيام' باب فضل الصيام' ح ۱۹۴۵۔

(۵) مولانا امین احسن اصلاحی' تدبر قرآن' ج ۱' ص ۴۵۲۔

(۶) الفراهيدي' كتاب العين' ص ۴۸۹۔

(۷) امام راغب الاصفهانی' مفردات القرآن' ص ۵۴۸۔

(۸) سید قطب شہید، فی ظلال القرآن، ج ۱، ص ۲۵۸۔

(۹) مسند احمد، مسند ابی ھریرۃ، ح ۷۲۶۱۔

(۱۰) محمود الآلوسی البغدادی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ج۲، ص ۱۸۔

(۱۱) ابومنصور الأزھری، تھذیب اللغۃ، ج ۱۲، ص ۲۵۹۔

(۱۲) صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل الصیام، ح ۱۹۴۵۔

(۱۳) **مولانا ابوالکلام آزاد نے تو عناصر ثلاثہ یعنی تقویٰ، تکبیر ربّ اور شکر بتائے ہیں۔ لیکن مضمون نگار نے ان کے ساتھ صبر کے عنصر کا اضافہ کیا ہے، کیونکہ یہ بھی روزے کا ایک اہم نتیجہ ہے۔**

(۱۴) سنن ابن ماجۃ، کتاب الصیام، باب ما جاء فی الغیبۃ والرفث للصائم، ح ۱۶۸۰۔

(۱۵) مولانا ابوالکلام آزاد، ارکان اسلام، ص ۲۱۴۔

(۱۶) مولانا اشرف علی تھانوی، المصالح العقلیۃ للاحکام النقلیۃ، ص ۱۰۶۔

(۱۷) امام غزالی، احیاء العلوم، ج ۱، ص ۳۶۵۔

(۱۸) **یہ چھ نکات تو امام غزالی کے ہیں، لیکن آگے وضاحت ان کی نہیں ہے۔**

(۱۹) حاکم، کتاب الرقاق، ح ۷۹۸۸۔ **ناصر الدین البانیؒ کے نزدیک یہ حدیث** "ضعیف جدًا" **ہے۔**

(۲۰) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب فضل الصوم، ح ۱۷۶۱۔

(۲۱) مسند احمد، مسند ابی ھریرۃ، ح ۹۳۰۸۔

(۲۲) **حکیم محمد سعید، تقلیل غذا، وسیلۂ صحت (مضمون)، ص ۴۔**

(۲۳) علاؤ الدین البغدادی (المعروف) الخازن، لباب التأویل فی معانی التنزیل، ص ۲۲۴۔

*

مکاشفاتِ اقبال

قیامِ پاکستان اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ

مظفر حسین

علامہ اقبال ایک شاعر اور فلسفی ہونے کے علاوہ ایک حقیقت پسند سیاسی مفکر تھے اور انہوں نے سیاست میں عملاً بھی حصہ لیا، لیکن یہ ان کی شخصیت کے اضافی پہلو ہیں۔ بنیادی طور پر وہ ایک روحانی شخصیت تھے اور انہیں اس بات کا پختہ یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عصر حاضر میں اُمت مسلمہ کی رہنمائی کا فریضہ سونپا ہے اور وہ خدا کی طرف سے مسلمانوں کے عروج اور ترقی کا خاص پیغام لے کر آئے ہیں:

بے نیازانہ ز شوریدہ نوائم مگذر
مرغ لاہوتم از دوست پیامے دارم

''میری شاعری کو ایک جنونی کی باتیں کہتے ہوئے بے نیازی سے مت گزر جاؤ۔ میں طائر لاہوتی ہوں اور تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا پیغام لایا ہوں''۔

پیر گردوں با من این اسرار گفت
از ندیماں رازہا نتواں نہفت

''اللہ تعالیٰ نے یہ اسرار مجھ پر الہام کیے ہیں اور میں نے ان اسرار کو اپنے دوستوں سے چھپایا نہیں ہے''۔

اپنے بارے میں یہ غیر معمولی اعتماد ان کے دو روحانی مکاشفات پر مبنی ہے جو انہیں ۱۹۰۷ء اور ۱۹۲۳ء میں پیش آئے اور جن کی طرف آپ نے سید ظفر الحسن کے نام اپنے خط مورخہ ۶/ اگست ۱۹۳۲ء میں اِن الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا ہے:

''مجھے پچیس سال ہوئے جب اس کا احساس ایک عجیب و غریب طریق میں ہوا۔ اس وقت میں انگلینڈ میں تھا۔ اس کے بعد ہندوستان میں اس کا اعادہ ہوا۔ اس کو اب کئی سال گزر چکے ہیں۔''

پہلا مکاشفہ مارچ ۱۹۰۷ء میں قیامِ لندن کے دوران ہوا جس میں آپ نے قدسیوں کی زبانی سنا کہ قدرت کی طرف سے اُمت مسلمہ کو دوبارہ عروج عطا ہونے والا ہے۔ سید نذیر نیازی مرحوم سے آپ نے اس مکاشفہ کی تفصیلات بھی بیان کی تھیں، جس کا بدقسمتی سے کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں، البتہ ایک غزل میں اس کا برملا اظہار ملتا ہے جو ’بانگ درا‘ میں شامل ہے اور یہ واحد غزل ہے جس پر بطور ’عنوان‘ مارچ ۱۹۰۷ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اس غزل میں وہ اپنے مکاشفہ کے حوالے سے فرماتے ہیں: ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اسی غزل میں انہوں نے مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کے لیے اپنے عزم کا واشگاف اعلان کیا ہے: ؎

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہو گا

نیز اسی غزل میں ان کے اس یقین کا اظہار بھی موجود ہے کہ ان کا درماندہ کارواں تمام تر مشکلات کے باوجود بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوگا: ؎

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہو گا

علاوہ ازیں نظم ’طلوعِ اسلام‘ کے ابتدائی بند میں دوبارہ اسی پیش گوئی کو بڑے زوردار انداز میں پیش کیا ہے: ؎

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا سے ہی ہے گوہر کی سیرابی
عطا مؤمن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

مارچ ۱۹۰۷ء کی مکاشفاتی غزل کے سولہ سال بعد چودھری محمد حسین کے نام اپنے ایک مکتوب مورخہ ۳۰/اگست ۱۹۲۳ء میں علامہ اقبال نے اپنے دوسرے روحانی مکاشفے کا ذکر کیا ہے جس میں آپ نے لکھا ہے کہ عالمِ بالا میں قدسیوں میں یہ شور مچا ہوا ہے کہ مسلمانوں کو فتح اور

*

کامرانی نصیب ہونے والی ہے' لیکن زمین کے باسیوں کو اس کی کچھ خبر ہی نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> *"There is a lot of enthusiasm on heavens in respect of the victory of the Muslims but those on earth are silent. May God have pity on them. Our religious scholars and saints turned Islam into an ancient Asian creed."*

> ''عالمِ بالا میں مسلمانوں کی فتح و نصرت کے بارے میں بڑا جوش و خروش ہے' لیکن ساکنانِ زمین مہر بلب ہیں۔ خدا ان کے حال پر رحم فرمائے۔ ہمارے علماء و صلحاء نے اسلام کو ایک قدیم ایشیائی مذہب بنا کر رکھ چھوڑا ہے''۔

علامہ اقبال کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ ہمارے علماء و صلحاء نے اسلام کی جدیدیت کا احساس نہیں کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص صرف انہی لوگوں کی تحریروں پر انحصار کرتے ہوئے اسلام کا مطالعہ کرے اور اس بات کو پیش نظر نہ رکھے کہ اسلام آج سے چودہ سو سال پہلے آیا تھا تو کبھی اس حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکتا کہ اسلام کس قدر جدید مذہب ہے۔ چنانچہ وہ اس خط میں لکھتے ہیں:

> *"If one studies Islam through the writings of Muslims not knowing that Islam's advent took place thirteen hundred years ago, he will not reach the conclusion that Islam is such a modern religion. I am sorry that Muslims have never recognised the modernity of Quran. They instead have interpreted its subject and truths in light of ancient peoples and thus have mutilated its real sense and intent."*

> ''اگر کوئی شخص یہ نہ جانتا ہو کہ اسلام آج سے تیرہ سو سال پہلے آیا تھا' اور اسلام کا مطالعہ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کی روشنی میں کرے' تو کبھی اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا کہ اسلام اس قدر جدید مذہب ہے۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ مسلمانوں نے کبھی قرآن کی جدیدیت کا احساس نہیں کیا۔ اس کے برعکس انہوں نے قرآن کے موضوع اور حقائق کی تشریح قدیم اقوام کی روشنی میں کر کے اس کے اصل مفہوم اور مدعا کو ہی مسخ کر ڈالا''۔

علامہ اقبال کے خط کے ان مندرجات سے جہاں یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ انہیں اس بات کا پختہ یقین تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو دوبارہ عروج حاصل ہوگا' وہاں وہ اس بات پر بھی سخت رنجیدہ اور دل گرفتہ تھے کہ مسلمانوں نے قرآن کی جدیدیت کا احساس نہیں کیا۔

ہمارے علماء کی لکھی ہوئی تفاسیرِ قرآن عصر حاضر کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کا حل پیش نہیں کرتیں اور صدیوں پرانے حالات و واقعات کے بیان سے آگے ان کے پاس کچھ کہنے کو باقی نہیں رہتا۔

علامہ اقبال نے قرآن حکیم کا مطالعہ عصر حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اسلام کا مطمحِ نظر کشور کشائی ہرگز نہیں، بلکہ وہ اپنی اعلیٰ معاشی اور جمہوری اقدار کی اساس پر معاشرہ کی تشکیل و تنظیم کے ذریعے تسخیرِ قلوب کا مطمحِ نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے نکلسن کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:

> ''مجھے پورے وثوق کے ساتھ یقین ہے کہ علاقوں کی فتح اسلام کے اصل پروگرام کا حصہ نہیں ہے، اور میرے خیال میں کشور کشائی کی مہم سے اسلام کی قلوب کو مسخر کرنے والی عالمگیر انسانی اخوت کو بے حد نقصان پہنچا اور اس نے معاشرہ میں جمہوری اور معاشی نظم پیدا کرنے اور نشوونما دینے والی ان کونپلوں کو نوچ ڈالا جو مجھے قرآن و حدیث کے صفحاتِ مقدسہ میں جابجا بکھری نظر آتی ہیں''۔

اپنے مکاشفات کی بنا پر علامہ اقبال کا خیال یہ تھا کہ ہندی مسلمانوں کو عصر حاضر میں جب اپنی ایک آزاد منظّم ریاست قائم کرنے کا موقع ملے گا تو وہ قرآن کی جدیدیت کو بروئے کار لا کر ایک جدید اسلامی ریاست قائم کر سکیں گے۔ چنانچہ خطبۂ الٰہ آباد میں انہوں نے جب پاکستان کا نام استعمال کیے بغیر ہندوستان میں ایک آزاد مسلم ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا تو اس میں واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ:

> ''اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عرب امپیریلزم کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب ہو جائے گا''۔

اسلام کے صحیح معانی کی تجدید اور زمانۂ حال کی روح سے قریب تر ہونے کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ قرآن کی تشریح و تفسیر کے ذریعے دورِ حاضر کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کا حل پیش کیا جائے۔ اسی چیز کو علامہ اقبال ''قرآن کی جدیدیت'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ چودھری محمد حسین کے نام محولہ بالا خط کے آخر میں آپ لکھتے ہیں کہ مسلمان قوم کی نشأۃِ ثانیہ تو سیاسی آزادی ملنے سے حاصل ہو جائے گی، لیکن اس کے بعد اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی ضرورت ہے، جس کے لیے ایک ایسے مفسرِ قرآن کی ضرورت ہے جو قرآن کی

*

جدیدیت کو واضح کرے اور قرآن کی حکمت گمشدہ مسلمانوں کو لوٹا دے۔

"Now alongwith the renaissance of Muslim communities the renaissance of Islam is also needed. I pray to God almighty that He, for the sake of His beloved, the prophet(PBUH) produces such an interpreter among Muslims who gets at the lost wisdom once more and offers it to ummah. Our demise is not near at hand, the Quran still holds on."

''اب مسلم اقوام کی نشأۃِ ثانیہ کے ساتھ ساتھ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ بھی درکار ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک رسول اللہ ﷺ کے طفیل مسلمانوں میں ایک ایسا مفسرِ قرآن پیدا کرے جو اس کی ''گمشدہ حکمت'' اُمت مسلمہ کو لوٹا دے۔ ہمارا خاتمہ قریب نہیں (کیونکہ) قرآن آج بھی ہمارا رہنما اور کفیل ہے۔''

چودھری محمد حسین کے نام خط کا یہ آخری حصہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے' کیونکہ اس میں علامہ اقبال نے مسلمانانِ ہند کی نشأۃِ ثانیہ اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کو الگ الگ شمار کرتے ہوئے اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کو قرآن حکیم کی جدیدیت کے ساتھ مشروط کیا ہے۔

قیامِ پاکستان

علامہ اقبال کے مکاشفات کے عین مطابق سیاسی آزادی اور قیامِ پاکستان کی صورت میں قومی نشأۃِ ثانیہ کی بات تو پوری ہو گئی' لیکن اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے سلسلہ میں علامہ اقبال کا خواب ہنوز تشنۂ تعبیر ہے جو قرآن کی ''جدیدیت'' کو بروئے کار لانے سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔

مولانا مودودی نے فرمایا تھا کہ اسلامی فکر کا موجودہ سرمایہ ہماری کفایت نہیں کرتا' کیونکہ یہ ہزار سالہ پرانی زبان میں ہے جسے دورِ حاضر کا نوجوان سمجھ نہیں سکتا اور ہزار سالہ پرانی زندگی سے تعلق رکھتا ہے جو آج کہیں موجود نہیں۔ اور جو لوگ حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کا نام لیتے ہیں انہیں اگر کسی خطہ میں اسے قائم کرنے کا موقع مل جائے تو ناکام ہوں گے' کیونکہ دورِ جدید میں اسلامی ریاست قائم کرنے کے لیے جو فکری سرمایہ درکار ہے وہ ہمارے پاس موجود ہی نہیں۔

اگر مولانا مودودی اور دیگر علماء اپنی زندگی یہ فکری سرمایہ فراہم کرنے کے لیے وقف کر دیتے تو پاکستان میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے امکانات بہت روشن ہو جاتے۔ لیکن انہیں یہ خطرہ محسوس ہوا کہ ترکی کو مثال بنا کر پاکستان میں بھی سیکولرزم قدم جما لے گا۔ اس لیے انہوں نے عملی سیاست میں حصہ لینے کو ترجیح دی اور اپنے اصل کام سے غافل ہو گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی

دوسرے مہم جو علماء نے بھی دین کے نام پر سیاسی جماعتیں قائم کر کے ''دین'' اور ''سیکولرزم'' کی کشمکش کو ہوا دی جس کی وجہ سے ملک میں ایک خاص قسم کی ''سیاسی برہمنیت'' کو فروغ ملا اور علماء کے مطالبۂ نفاذِ اسلام کو تھیا کریسی کے نفاذ کے مترادف سمجھا جانے لگا۔ فرقہ پرست دینی جماعتوں نے جب اپنی اپنی فقہ کے نفاذ کو سیاسی مطمحِ نظر قرار دیا تو اسلام کو ایک وحدت خیز قوت کے بجائے انتشار انگیز سیاسی عامل سمجھا جانے لگا اور قومی اتفاق رائے نہ ہونے کی وجہ سے نفاذِ اسلام کی منزل دُور سے دُور ہوتی چلی گئی۔

علامہ اقبال کی آرزو کے مطابق اگر قرآن کی جدیدیت کو بروئے کار لایا جاتا تو پاکستان میں اسلام اور سیکولرزم کی بحث ہی نہ چھڑتی۔ لیکن ہمارے دینی رہنماؤں نے آج تک اس بات کا احساس نہیں کیا کہ سیاسی میدان میں ''سیکولر عناصر'' سے اقتدار چھیننے سے زیادہ فکری محاذ پر انہیں مسخر کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کام قرآن کی جدیدیت کو بروئے کار لائے بغیر ممکن نہیں۔

ہمارے علماء اسلام کو ''قدیم ایشیائی مذہب'' کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی ہیں اور اجتہادی بصیرت سے محروم ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ ''خطباتِ بہاولپور'' میں فرماتے ہیں کہ جب قرآن حکیم نے حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کو بادشاہ کے لقب سے نوازا ہے تو ہم ملوکیت کو حرام نہیں قرار دے سکتے' لیکن اس کے برعکس علامہ اقبال فرماتے ہیں:

غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است

''میں اس جہاں پناہ کے فقر کا غلام ہوں کہ جس کے دین میں ملوکیت حرام ہے''۔

علامہ اقبال ملوکیت کے حرام ہونے کی دلیل نبی کریمﷺ کی زندگی سے لاتے ہیں' جنھوں نے نہ خود بادشاہت کا طریق اپنایا اور نہ ہی اپنے بعد ملوکیت کی کوئی گنجائش چھوڑی۔ اور یہ قرآن کے تصورِ توحید (لاسلاطین' لاکلیسا' لا الہٰ) کا اعجاز تھا کہ آپؐ کے وصال کے بعد خلافت کی شکل میں شورائیت کا جمہوری اصول اپنایا گیا ہے' جسے علامہ اقبال ''روحانی جمہوریت'' کا نام دیتے ہیں اور تشکیل وتأسیس حریت' مساوات اور اخوتِ بنی نوع آدم کو مقصودِ رسالتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح ''خطباتِ بہاولپور'' میں ہی ڈاکٹر محمد حمید اللہ فرماتے ہیں کہ عہد نبویﷺ سے لے کر آج تک قانون سازی ایک پرائیویٹ چیز رہی ہے اور کبھی حکومت کی اجارہ داری نہیں رہی' جبکہ اس کے برعکس علامہ اقبال پارلیمنٹ کو اجتہاد اور قانون سازی کا حق دیتے ہیں اور اسے اسلامی حدود کا پابند

*

رکھنے کی تدبیر بھی بتلاتے ہیں۔ وہ الیکشن اور ووٹ کو بیعت کی جدید شکل قرار دیتے ہیں۔ علامہ اقبال کا موقف ہے کہ اسلام پر ملوکیت کی ہزار سالہ گرفت نے مسلمانوں میں ان اداروں کو قائم نہیں ہونے دیا۔ اور دورِ حاضر کے پیچیدہ معاشرتی' معاشی اور سیاسی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بیک وقت قدیم اور جدید علوم میں جس قسم کی بصیرت درکار ہے' وہ کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں' لہٰذا ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اجتماعی کوشش درکار ہے جس کے لیے پارلیمنٹ کا ادارہ اجتہاد و اجماع کے لیے فورم کا کام دے سکتا ہے۔ صرف یہی دو مثالیں یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ڈاکٹر حمید اللہ قرآن کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے اسلام کو ایک ''قدیم ایشیائی مذہب'' کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ہزار سالہ پرانی روایت ملوکیت سے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں' جبکہ اس کے برعکس علامہ اقبال روحِ عصر کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے قرآن اور اسلام کی ''جدیدیت'' کو بروئے کار لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

لیلۃ القدر میں قیامِ پاکستان کی معنویت

لیلۃ القدر میں پاکستان کا وجود پذیر ہونا گہری معنویت کا حامل ہے۔ سورۃ الدخان کی آیت ۳ اور ۴ میں لیلۃ القدر کی دو خصوصیات بیان کی گئی ہیں:

(۱) یہ وہ رات ہے جس میں قرآن حکیم نازل ہوا۔ (آیت ۳)

(۲) یہ وہ رات ہے جس میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ کیا جاتا ہے۔ (آیت ۴)

چنانچہ لیلۃ القدر میں پاکستان کے قیام کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے لیے اس یاددہانی کے ساتھ عمل میں آیا کہ پاکستان کی بقا' ترقی اور سرفرازی کا سرچشمہ حکمت قرآن ہے۔ یہی وہ حکمت قرآن ہے جسے علامہ اقبال نے ''قرآن کی گمشدہ حکمت'' قرار دیا ہے اور اس کی بازیافت کو ''قرآن کی جدیدیت'' سے موسوم کیا ہے۔

ماہِ رمضان قرآن حکیم کے ''ریفریشر کورس'' کا مہینہ ہے جس میں تراویح کی صورت میں قرآن حکیم کا دورہ مکمل کیا جاتا ہے اور ہر سال ماہِ رمضان میں لیلۃ القدر کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ﴾ والی ذات کی طرف سے قرآن کو نئی شان کے ساتھ نازل کیا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے احادیث کے مطابق جبرئیل علیہ السلام حضور نبی کریم ﷺ کو ہر سال ماہِ رمضان میں قرآن حکیم کا دورہ مکمل کروایا کرتے تھے۔ قرآن حکیم کی اسی نئی شانِ جدیدیت کے بارے میں سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰ میں بھی بڑے واضح الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے:

''لوگو! ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے۔ تم یہ بات

سمجھتے کیوں نہیں ہو؟‘‘

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اگر اس آیت کے مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے تو آج ﴿فِيهِ ذِكْرُكُمْ﴾ کے مخاطب براہِ راست ہم لوگ ہیں اور ﴿فِيهِ ذِكْرُكُمْ﴾ کا مطلب اس کے سوا اور کیا لیا جا سکتا ہے کہ قرآن آج بھی ہمارے جملہ انفرادی اور اجتماعی مسائل کے سلسلے میں ہدایت کے لیے کفایت کرتا ہے‘ بشرطیکہ ہم اسے اس انداز میں سمجھنے کی کوشش کریں کہ گویا قرآن موجودہ حالات میں ہمارے لیے آج ہی نازل ہوا ہے۔ اسی طریقے سے ہم قرآن کی جدیدیت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں: ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

قرآن حکیم کی ’’جدیدیت‘‘ کے سلسلے میں ہماری نارسائیوں کی شکایت کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں علامہ اقبال نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا تھا کہ روحانی اعتبار سے تو ہم تخیلات اور احساسات کے ایک ایسے قید خانے میں بند ہو کر رہ گئے ہیں جہاں علماء اور فقہاء کے قدیم فرسودہ خیالات کی زنجیروں نے ہمیں بری طرح جکڑ رکھا ہے۔ اور تلقین کی تھی کہ اب ہمیں ان زنجیروں کو توڑ ڈالنا چاہیے جو ہم نے گزشتہ کئی صدیوں سے اپنے گرد لپیٹ رکھی ہیں اور گہرے تأسف کے ساتھ فرمایا: ’’ہم پرانی نسل کے لوگوں کو شرم آنی چاہیے کہ ہم نے اپنی نئی نسلوں کو اُن سیاسی‘ معاشی اور مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں کیا جو انہیں مستقبل میں پیش آنے والے ہیں‘‘۔

علامہ اقبال ایسے دانائے راز خال خال ہی پیدا ہوتے ہیں جن پر قدرت قرآن کی جدیدیت کے راز بذریعہ الہام منکشف کرتی ہے۔ مگر قدرت کی فیاضی دیکھئے کہ علامہ اقبال کے بعد ڈاکٹر محمد رفیع الدین صحیح معنوں میں ان کے جانشین ثابت ہوئے‘ جن کی کتابیں ’’Ideology of the Future‘‘ اور ’’قرآن اور علم جدید‘‘ علامہ اقبال کے اسی مکتب فکر کی مؤثر اور بھرپور نمائندگی اور ترجمانی کرتی ہیں جو قرآن کی جدیدیت کا علمبردار ہے اور یہ بات ان کی کتابوں کے عنوانات سے ہی عیاں ہے‘ لیکن ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کے بعد فکر اقبال کا کوئی ایسا وارث ابھی تک پیدا نہیں ہوا جو انہی کی طرح قرآن کی جدیدیت کے اسرار و رموز بیان کرے۔

*

قحط الرجال اور جدیدیتِ قرآن کی تلاش

سوال یہ ہے کہ اس قحط الرجال میں کیا کیا جائے؟ ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ قرآن کی جدیدیت تک رسائی حاصل کرنے کا کیا کوئی ایسا طریقہ بھی ہے جو اس قحط الرجال کے زمانے میں ہمارے کام آ سکے؟ علامہ اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین جیسے دانائے راز تو روز روز پیدا نہیں ہوا کرتے' تاہم اس کمی کی تلافی کے لیے اجتماعی کاوشیں بروئے کار لائی جاسکتی ہیں اور اس طریق کار کو اپنانے کی قرآن حکیم بھی بڑی واضح الفاظ میں تلقین کرتا ہے۔ سورۃ النحل (آیت ۴۴) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> ''پچھلے رسولوں کو بھی ہم نے روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا اور اب یہ ذکر (اے نبیؐ!) تم پر نازل کیا تا کہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح وتوضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لیے اُتاری گئی ہے اور تا کہ لوگ (خود بھی) اس میں غور وفکر کریں''۔

اس آیت میں یہ نکتہ انتہائی معنویت کا حامل ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں جب قرآن ان پر نازل ہو رہا تھا اور آپؐ اس کی تعلیم کی توضیح وتشریح بھی کر رہے تھے عین اس وقت بھی قرآن حکیم اپنے ہر مخاطب سے یہ تقاضا کر رہا تھا کہ وہ خود بھی قرآن میں غور وفکر کرے اور اپنی زندگی کے جملہ انفرادی واجتماعی مسائل کے بارے میں اس سے ہدایت طلب کرے۔ چنانچہ اگر آج ہم بھی تفکر فی القرآن کو فقط علماء وفقہاء کا تخصص اور فریضہ نہ سمجھیں بلکہ قوم کی اجتماعی کاوشوں کو بروئے کار لائیں تو اس سے قرآن کی جدیدیت تک رسائی حاصل کرنے میں یقیناً بڑی مدد مل سکتی ہے۔ نیز اس آیت کی رو سے یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن حکیم میں غور وفکر ہر مسلمان کا فریضہ ہے خواہ اس کا علمی اور عقلی مرتبہ کتنا ہی فروتر کیوں نہ ہو اور وہ صرف تراجم کی مدد سے ہی قرآن کو سمجھتا ہو۔ بلاشبہ اگر ناظرہ قرآن پڑھنے والا محض تلاوتِ قرآن پر ثواب کا مستحق ہے تو تراجم کی مدد سے قرآن پر غور وخوض کرنے والا بھی اجر کا امیدوار ہو سکتا ہے۔

علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں قرآن کی جدیدیت کو بروئے کار لانے کے لیے اجتماعی کاوش کے سلسلے میں دو تجاویز دی تھیں۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ اس زمانے میں ہمارے قدیم مکاتب فقہ کا سرمایۂ فکر ناکافی ہو گیا ہے اور نئی اسلامی فقہ کی ضرورت ہے' تا کہ عصر حاضر کے نئے تقاضوں کو ادا کرنے کے لیے قانون سازی کی جا سکے۔ لیکن تنہا علماء اس کام کے اہل نہیں' کیونکہ وہ جدید علم قانون اور دورِ حاضر کے نئے

سماجی اور معاشی مسائل کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ اور جو مسلم وکلاء جدید علمِ قانون میں مہارت رکھتے ہیں وہ علومِ دین سے زیادہ واقف نہیں ہوتے۔ چنانچہ علامہ اقبال کا خیال تھا کہ علماء اور وکلاء پر مشتمل ایک تحقیقی ادارہ قائم کر دیا جائے تو دونوں کے باہمی تعامل اور مشترکہ کوششوں سے اسلامی قانون کی از سرِ نو تشریح، توسیع اور حفاظت کرنے سے ایسی نئی اسلامی فقہ معرضِ وجود میں لائی جاسکتی ہے جو زمانۂ حال کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اسی طرح سے آپ نے پارلیمنٹ کو بھی اجتہاد کا حق دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ لازم قرار دیا کہ پارلیمنٹ میں ایسے علماء کی ایک معقول تعداد ہونی چاہیے جو قانون سازی کو اسلامی حدود کا پابند رکھنے کے لیے ایوان کی رہنمائی کر سکے۔

دوسری تجویز ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں مردوں اور عورتوں کے لیے ثقافتی ادارے قائم کرنے کے بارے میں تھی جن کا مقصد یہ بیان کیا گیا تھا کہ نوجوان نسل کو یہ بتایا جا سکے کہ انسان کی مذہبی و ثقافتی تاریخ میں اسلام نے اب تک کیا کچھ حاصل کیا ہے اور ابھی کیا کچھ حاصل کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بھی قرآن اور اسلام کی جدیدیت کی تلاش سے ہی منسلک تھا اور ان اداروں کا مقصد قرآن اور اسلام کی جدیدیت کو فروغ دینا تھا' اس لیے علامہ اقبال قرآن کی جدیدیت کو بروئے کار لانے کے لیے ایسے ادارے قائم کرنے کی ضرورت کا احساس دلا رہے تھے اور ان اداروں میں علماء اور غیر علماء دونوں کا اشتراک ضروری خیال کرتے تھے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں ''اسلام اور سائنس'' کے عنوان سے جیروم آر راویٹز (Jerome R-Ravetz) کا جو مقالہ شامل ہے اس میں اس نے اسلامی دنیا میں سائنس کے زوال پذیر ہونے کی بنیادی وجہ یہ بتائی ہے کہ مسلمان ممالک میں کہیں بھی سائنس کا اداراتی ڈھانچہ قائم نہیں کیا گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ نویں صدی عیسوی میں مسلم سائنس دان علمِ ریاضی، علمِ ہیئت، علمِ بصریات، علمِ کیمیا اور علمِ طب میں شاندار پیش رفتیں کر رہے تھے' لیکن ان کی یہ ترقی دیر تک قائم نہ رہ سکی جس کا واحد سبب وہ یہ بیان کرتا ہے کہ:

> ''مسلمان سائنس دان اگرچہ اپنی اپنی جگہ بڑے بڑے تخلیقی کارہائے نمایاں انجام دے رہے تھے' لیکن ان کی معاشرتی بنیاد (Social Base) بہت کمزور تھی' جس کی وجہ سے ان میں وہ علمی تعاون مفقود تھا جو نچلے درجے کے سائنس دانوں کو بھی مؤثر بنا دیتا ہے''۔

یہی صورت حال دینی علوم کی ترقی کے بارے میں ہمیں آج بھی درپیش ہے' چنانچہ اس

*

جمود سے نکلنے کی بھی واحد تدبیر یہی ہے کہ دینی علوم کی تحقیق میں معاشرتی بنیاد کو وسعت دی جائے تاکہ دینی علوم کو جدیدیت آشنا کیا جاسکے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن حکیم کی تشریح وتفسیر پر کسی ایک عالمِ دین یا کسی ایک مکتبِ فکر کی اجارہ داری تسلیم نہ کی جائے اور قرآن حکیم میں غور وفکر کا حق ہر شخص کو دیا جائے جیسا کہ خود قرآن کا منشا ہے۔لیکن ہر فرد کے حاصلاتِ تفکر فی القرآن کو ثقافتی اداروں (Cultural Institutes) میں ایسے روشن خیال علماء کی نگرانی میں زیر بحث لایا جائے جنہیں عربی زبان اور قرآن وحدیث پر پورا پورا عبور حاصل ہو اور وہ یہ فیصلہ دینے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں کہ ان کا تفکر فی القرآن نبی کریم ﷺ کی تشریح وتوضیح کے منافی تو نہیں اور وہ اپنے خیالات میں گمراہی کے راستے پر تو نہیں چل نکلے۔

تحریک تفکر فی القرآن

یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ گزشتہ پچیس سال کے عرصے میں حافظ نذر محمد' ڈاکٹر اسرار احمد' جاوید احمد غامدی' سید شبیر احمد اور ان جیسے کئی اور علماء نے نوجوان نسل میں رجوع الی القرآن کا ذوق وشوق پیدا کرنے میں شاندار خدمات انجام دی ہیں اور حلقہ ہائے درس قرآن قائم کر کے لوگوں کے دلوں میں نورِ قرآن کی شمعیں فروزاں کی ہیں۔ یہ حضرات زیادہ تر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ رجوع الی القرآن کی تحریک کے ساتھ ساتھ تفکر فی القرآن کی تحریک کا آغاز کیا جائے اور اس غرض کے لیے پاکستان کے تمام شہروں میں جہاں جہاں بھی ممکن ہو ایسے کلچرل انسٹیٹیوٹ قائم کیے جائیں جہاں تمام مکاتبِ فکر کے لوگ جمع ہوسکیں اور حالاتِ حاضرہ اور مسائل اُمہ کو زیر بحث لا کر قرآن سے رہنمائی اور ہدایت حاصل کرسکیں۔

اس میں شک نہیں کہ پاکستان کے موجودہ حالات انتہائی مایوس کن ہیں' لیکن ہمیں اس بات کو ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ پاکستان کا قیام لیلۃ القدر کی مبارک ساعتوں میں اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ فیصلہ کے تحت عمل میں آیا۔لہٰذا ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ پاکستان کا مستقبل بہت روشن ہے۔ البتہ اس سلسلے میں جو ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے ہمیں اسے پورا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ یعنی قرآن کی جدیدیت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اجتماعی کاوشوں کو بروئے کار لائیں تاکہ علامہ اقبال کی خواہش کے مطابق پاکستان میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی راہ ہموار کی جاسکے۔

ہمارے علماء نے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مغرب زدگی اور سیکولرزم کی مہر لگا کر انہیں دینی

اعتبار سے نا قابل اعتماد قرار دے رکھا ہے‘ حالانکہ ان میں سے کتنے ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اپنے محدود دینی علم کے باوجود اسلام کے معاشی اور سیاسی مسائل پر جدید علوم کی روشنی میں قابل قدر تحقیقی کام کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں دور کرنے کی بجائے قریب لایا جائے۔ علومِ تازہ کی سرمستی گناہ نہیں بلکہ کبھی کبھی یہ بھی قرآنی حقائق تک پہنچا دیتی ہے: ؎

کھلے ہیں سب کے لیے غریبوں کے میخانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

....

گہے رسم و رہِ فرزانگی ذوقِ جنون بخشد
من از درسِ خردمنداں گریباں چاک می آئم

”کبھی کبھی عقل بھی انسان کو ذوقِ جنون بخش دیتی ہے۔ مجھے دیکھیے میں عقل مندوں کے درس سے اپنا گریبان چاک کر کے آیا ہوں“۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر رفیع الدین کا موقف تو یہ تھا:

”ہم نے علم کو علمِ دین تک اور دین کو قرآن اور حدیث کے الفاظ تک محدود کر دیا۔ حالانکہ اس وقت جس قدر صحیح اور سچا علم دنیا میں موجود ہے یا آئندہ زمانوں میں انسان کی ذہنی کاوش سے پیدا ہونے والا ہے وہ علم دین کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس زمانہ میں علوم کی ترقی قرآن کو بہت آگے لے گئی ہے لیکن ہم وہیں کے وہیں ہیں‘ بلکہ قرآن آگے جا رہا ہے اور ہمارا رُخ پیچھے کی طرف ہے“۔

اور اپنے اس موقف کے بارے میں انہیں اتنا یقین اور اس حد تک اعتماد تھا کہ انہوں نے علمِ جدید کا قرآن حکیم کے ساتھ رشتہ استوار کرنے کو نبوت سے ”معنوی قرب“ قرار دیا‘ وہ لکھتے ہیں:

”ہم میں سے بعض کا خیال ہے کہ اسلام کی والہانہ محبت کا جو مقام مسلمانوں کو اسلام کے ابتدائی دور میں حاصل تھا وہ پھر کبھی عود نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ((خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ)) لیکن ہم اس حدیث کی ایسی تشریح نہیں کر سکتے جو قرآن اور حدیث کے باقی ارشادات سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔

نبوت کا قرب ایسا ہے جیسے چراغ کی روشنی کہ جوں جوں ہم اس سے دور ہوتے جائیں‘ کم ہوتی جاتی ہے‘ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہاں تک ایمان اور اعتقاد کا تعلق ہے خیر القرون جیسا زمانہ کبھی عود نہیں کر سکتا۔

*

حضورﷺ کے زمانہ میں مسلمانوں کو جو اسلام کی شدید محبت حاصل تھی اگرچہ نبوت کی ہدایت کے بغیر اس کا حصول ہرگز ممکن نہیں' لیکن وہ کوئی ایسا کمال نہیں تھا جو انسان کو نبوت کے زمانی قرب سے ہی حاصل ہو سکتا ہو اور جس کے لیے انسان کی فطرت کے اندر مستقل طور پر کوئی سامان نہ رکھا گیا ہو۔ نبوت کے زمانی قرب نے ہمیں ایمان کی جس دولت سے مالا مال کیا تھا اب نشأۃِ ثانیہ میں نبوت کا معنوی قرب جو فلسفہ اور سائنس کے ذریعہ سے حاصل ہو گا پھر ہمیں اس سے مالا مال کرے گا اور یہ ایسا قرب ہو گا جسے زوال نہیں اور جو مرورِ زمانہ سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہوتا رہے گا''۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''ہو سکتا ہے کہ اسلام کا یہ آخری دور ابتدائی دور سے بھی بہتر ثابت ہو۔ حضورﷺ نے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے بڑے حوصلہ افزا الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے: ''خوش ہو جاؤ' خوش ہو جاؤ' بے شک میری اُمت کی مثال بارش کی طرح ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ابتدا بہتر ہے یا انتہا۔'' (المشکوٰۃ)

ڈاکٹر رفیع الدین اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ انسان کا ذہن کوئی ایسی علمی حقیقت دریافت نہیں کر سکتا جو فی الواقع ایک سچی حقیقت تو ہو لیکن قرآن کی تشریح وتفسیر نہ ہو۔ ان کا موقف بڑا دوٹوک ہے:

''سائنس اور فلسفہ کی ہر ترقی خواہ وہ دنیا کے کسی مقام پر اور کسی شخص کی وجہ سے ظہور میں آئے' قرآن کے درخت میں ایک نیا پتہ' نئی شاخ یا ایک نیا پھول یا پھل ہے۔ چونکہ علم کی ترقی جاری رہے گی اور علم وحی نبوت کی رہنمائی میں آخر کار اغلاط سے پاک ہوتا رہے گا' ظاہر ہے کہ قرآن کی شاخیں' پھل' پھول اور پتے قیامت تک نکل نکل کر نوعِ انسانی کو بہارِ حسن دکھاتے رہیں گے اور اس کی ہر قسم کی ترقیوں کو ممکن بناتے رہیں گے اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب قرآن کے علم کا درخت پھیل کر تمام کائنات کا احاطہ کرے گا اور دنیا کا سارا علم اپنی ساری وسعتوں کے باوجود فقط قرآن کا علم ہو گا''۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر رفیع الدین اس بات میں پختہ یقین رکھتے تھے کہ قرآن حکیم جدید علوم یعنی فلسفہ وسائنس کے تمام حقائق کو علمِ وحی کی روشنی میں اغلاط سے پاک کر کے اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی چیز کو علامہ اقبال نے جدیدیت قرآن سے تعبیر کیا ہے اور اسے دورِ حاضر میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی' جو پاکستان کی غرض وغایت ہے' لازمی

شرط ٹھہرایا ہے۔

چنانچہ ہمارا یہ خیال ہے کہ جدیدیت قرآن تک رسائی حاصل کرنے کے لیے پاکستان میں تفکر فی القرآن کی جان دار اور زوردار تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ قرآن ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پکار رہا ہے کہ کیا تمہارے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں کہ تم قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟ لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ عام مسلمان اس پکار کا مخاطب صرف اور صرف علماء کرام کو سمجھتا ہے اور ہمارے علماء بھی قرآن حکیم میں عام مسلمانوں کو فرداً فرداً غور کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے' کیونکہ وہ انہیں اس کا اہل ہی نہیں سمجھتے۔

آخری بات

قرآن کی جدیدیت کے ذریعے علامہ اقبال نے اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا جو خواب دیکھا تھا اس کا ذکر انہوں نے مکاشفاتی انداز میں پیامِ مشرق کی نظم ''نقشِ فرنگ'' میں بھی کیا ہے جس میں وہ پوری تحدی سے دعویٰ کرتے ہیں کہ مغربی سرمایہ دارانہ استعمار کا قائم کردہ ظالمانہ عالمی نظام یقینی طور پر ختم ہو کر رہے گا اور اس کی جگہ اسلام کا منصفانہ عالمی نظام لے گا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی درپے تعمیر جہانِ دگر است

''آنکھ کھول اور دیکھ اگر تیری آنکھ نورِ بصیرت رکھتی ہے کہ زندگی ایک نیا جہاں تعمیر کرنے کے درپے ہے''۔

من دریں خاکِ کہن گوہر جاں می بینم
چشم ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم

''میں دنیا کی خاکِ کہن میں گوہرِ زندگی دیکھ رہا ہوں اور مجھے خاک کا ہر ذرہ اس انتظار میں آنکھیں کھولے نظر آتا ہے''۔

دانہ را کہ بآغوشِ زمیں است ہنوز
شاخ در شاخ برومند و جواں می بینم

''وہ دانہ جو ابھی زیرِ زمین پوشیدہ ہے' میں اسے جوان ہوتے اور شاخ در شاخ پھلتا پھولتا دیکھ رہا ہوں''۔

کوہ را مثل پرِ کاہ سبک می یابم
پرِ کاہے صفتِ کوہِ گراں می بینم

*

''مجھے (مغربی تہذیب کا) پہاڑ تنکے کی مانند ہلکا نظر آتا ہے اور پر کاہ (اسلام اپنی موجودہ کمزور حالت میں بھی) مجھے کوہِ گراں نظر آتا ہے۔''

انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیر افلاک

بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم

''وہ انقلاب جو آسمانوں کے ضمیر میں نہیں سما رہا' وہ مجھے صاف نظر آ رہا ہے اور نہیں جانتا کہ کیسے نظر آ رہا ہے۔''

''بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم'' کے الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ ان اشعار میں اسی دوسرے مکاشفہ کا بیان ہے جس کا ذکر علامہ اقبال نے چوہدری محمد حسین کے نام اپنے خط (مورخہ ۳۰/اگست ۱۹۲۳ء) میں کیا۔ ''پیامِ مشرق'' کی اشاعت بھی اس خط سے تین ماہ قبل (مئی ۱۹۲۳ء) ہوئی تھی اور نظم ''نقشِ فرنگ'' میں ہی آپ نے یہ پیام دیا ہے کہ ع ''وقت آن است کہ آئین دگر تازہ کنیم'' (وقت آ گیا ہے کہ ہم نیا آئین بروئے کار لائیں۔) یہ ''آئین دگر'' قرآن ہی کا آئین ہے جو بقول اقبال قرآن کی جدیدیت پر استوار ہوگا۔

قرآن حکیم چودہ سو سال قبل نازل ہوا۔ اس کے ایک ایک لفظ' ایک ایک حرف بلکہ زیرو زبر تک کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور اس بنا پر قرآن ہمیشہ کے لیے ناقابل تحریف ہے۔ تاہم اس کے الفاظ کی وسعتِ معانی لامحدود ہے' یعنی بقول اقبال ع ''صد جہاں پوشیدہ در قرآں ہنوز''۔ لیلۃ القدر ہر سال ہمارے لیے قرآن کی معنوی تازگی کا یہی پیغام لاتی ہے جسے علامہ اقبال قرآن کی ''جدیدیت'' سے موسوم کرتے ہیں اور اسے اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔

شب نزولِ قرآن میں پاکستان کا قیام قدرت کی طرف سے ہمارے لیے ایک اشارہ ہے کہ تفکر فی القرآن کے ذریعے قرآن کی جدیدیت کا سراغ لگا کر اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا آغاز کریں اور دنیا کو اسلامی عدل و احسان کے اس نئے عالمی نظام سے روشناس کرائیں جس کا آج سیاسی اور معاشی استحصال کی ماری مجبور و مقہور انسانیت کو شدت سے انتظار ہے۔ OO

*

فکر و نظر

تکفیر کا مسئلہ (۲)

(تکفیر معین کی شرائط)

حافظ طاہر اسلام عسکری ☆

اس سلسلے کا پہلا مضمون ''تکفیر کا مسئلہ'' کے زیر عنوان ماہنامہ میثاق کے شمارہ بابت جنوری ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا تھا' زیر نظر تحریر کے آغاز میں اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے' تا کہ ربطِ کلام واضح ہو سکے اور اگلے مباحث سمجھنے میں سہولت رہے۔

خلاصہ مباحثِ سابقہ

''تکفیر'' سے مراد ہے کسی کو کافر قرار دینا اور اس پر دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کا حکم لگانا۔ یہ ایک انتہائی حساس اور سنگین نوعیت کا مسئلہ ہے' اس لیے کسی پر کفر کا حکم لگانے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے کہ اگر وہ شخص حقیقتاً کافر نہ ہوا تو یہ کفر ازروئے حدیث نبویؐ فتویٰ لگانے والے پر ہی لوٹ آتا ہے۔ صحابہ کرامؓ اور سلف صالحینؒ اس سلسلے میں انتہائی محتاط تھے۔ تکفیر سے دُنیوی و اُخروی ہر دو پہلوؤں سے انتہائی سنگین اثرات و نتائج مرتب ہوتے ہیں' مثلاً دنیا میں وہ شخص مسلمانوں کی نصرت و ولایت سے محروم ہو جاتا ہے اور آخرت میں دائمی جہنمی قرار پاتا ہے۔ لہٰذا احادیث اور تکفیر کے سنگین نتائج کے پیش نظر اس معاملے میں غایت درجے کی احتیاط برتنی چاہیے۔

تکفیر کے باب میں بعض گروہ افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ چنانچہ ایک طرف چھوٹی چھوٹی بات پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جاتا ہے' جبکہ دوسری جانب صریح کفریہ عقائد و اعمال کے باوجود بھی لوگوں کو مسلمان قرار دینے پر اصرار کیا جاتا ہے اور ان کی تکفیر سے روکا جاتا ہے۔ یہ دونوں رویے غیر متوازن ہیں۔ اہل سنت والجماعت کا نقطۂ نظر اعتدال پر مبنی ہے اور وہ یہ کہ محض کسی معصیت یا گناہ پر کسی مسلمان پر کفر کا حکم لگانا قطعاً حرام ہے' لیکن کفر والحاد اور لادینیت وارتداد جیسے جراثیم کے سدباب کے لیے شریعت کے مسلّمہ اصول وضوابط کی روشنی میں مختلف افراد اور گروہوں کو کافر قرار دیا جا سکتا ہے۔

مسئلہ تکفیر میں بے احتیاطی اور جلد بازی کی درج ذیل وجوہات ہو سکتی ہیں: (۱) دین و اہل دین کے خلاف معاندانہ روش' (۲) اربابِ اقتدار کی نفاذ شریعت میں پس و پیش' (۳) حامیانِ نفاذ شریعت پر ظلم و

☆ شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

ستم‘ (۴) تعلیماتِ شرع سے ناواقفیت اور دین کا ناقص فہم۔

علمائے اُمت اور مجتہدینِ ملت نے نصوصِ کتاب وسنت کی روشنی میں تکفیر کے چند عمومی اصول وضع کیے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

(۱) تکفیر میں ذاتی رجحانات اور گروہی میلانات یا ظن وتخمین پر مبنی خیالات ونظریات کے بجائے قرآن و سنت پر اعتماد کیا جائے گا۔

(۲) کفر کا حکم لگانے میں افراد کے ظاہر کا اعتبار ہوگا‘ قلبی معاملات خدا کے سپرد کیے جائیں گے۔

(۳) ایسے گناہ جو کفریہ ہوں وہ ایمان کے نقص کا باعث ہیں نہ کہ خاتمے کا‘ یعنی ایمان ناقص ہوجاتا ہے بالکلیہ ختم نہیں ہوتا۔

(۴) کفر کی دو قسمیں ہیں: کفرِ اکبر اور کفرِ اصغر۔ انہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۵) ایک ہی فرد میں ایمان اور نفاق کی بعض صفات جمع ہوسکتی ہیں۔

(۶) تکفیرِ نوع اور شخصِ معین کی تکفیر میں فرق ضروری ہے۔

....

تکفیرِ معین کے لیے شرائط کا پورا ہونا اور موانع کا زائل ہونا ضروری ہے

علمائے اسلام نے تحریر وتقریر کے ذریعے ان امور کی خوب وضاحت کردی ہے جو ایک شخص کے دائرہ اسلام سے نکلنے کا باعث بن سکتے ہیں۔ اصطلاحی زبان میں انہیں ’’نواقض الاسلام‘‘ کہا جاتا ہے‘ یعنی وہ اُمور جو کسی آدمی کے اسلام وایمان کو توڑنے کا موجب بنتے ہیں۔ اس سلسلے میں اہلِ علم کے پیشِ نظر کئی مصالح اور حکمتیں ہوتی ہیں‘ مثلاً:

(۱) ان دینی حدود کا بیان جن سے تجاوز درست نہیں اور اگر جان بوجھ کر ان کی خلاف ورزی کی جائے تو انسان ملت اسلامیہ سے خارج ہوجاتا ہے۔

(۲) حالات وظروف کی مناسبت سے پیش آمدہ بعض مسائل میں شرعی حکم کو اُجاگر کرنا۔

(۳) دشمنانِ دین کی ریشہ دوانیوں سے اسلامی عقائد وشعائر کو بچانا۔

(۴) لوگوں کو اُن کفریہ اقوال وافعال اور اعتقادات اپنانے سے مجتنب رہنے کی تلقین کرنا جو جہل ونادانی کی بنا پر بہت سے افراد میں دَر آتے ہیں۔ اسی بنا پر علمائے کرام نے کفر وارتداد کے یہ اسباب لوگوں کو باقاعدہ سکھانے کی تاکید کی ہے کہ وہ لاعلمی کی وجہ سے ان کے مرتکب ہو بیٹھتے ہیں۔

بعض لوگ اپنی غلط نگہی اور کم فہمی سے ان اسباب کی بنا پر متعین اشخاص پر کفر وارتداد کے فتوے ثبت کرنا شروع کر دیتے ہیں‘ جبکہ علمائے اُمت نے اس امر کی صراحت فرمائی ہے کہ مطلق

*

طور پر نواقض ایمان کی بنا پر تکفیر ایک بات ہے اور کسی فرد کو معین طور پر کافر کہنا بالکل ایک علیحدہ معاملہ ہے۔ اسی لیے ائمہ کرام نے فردِ معین پر کفر کا حکم لگانے کے لیے مستقل ضوابط بھی شرح وبسط سے بیان کر دیے ہیں۔ اہل علم کی تصریحات کے مطابق کچھ امور ایسے ہیں جن کا اثبات تکفیر کے لیے ضروری ہے۔ انہیں ''شرائطِ تکفیرِ معین'' کہا جاتا ہے۔ ان کے پہلو بہ پہلو بعض معاملات ایسے بھی ہیں جن کا زائل ہونا لازم ہے۔ یہ تکفیرِ معین کے موانع کہلاتے ہیں۔

● مجد دِ دین وملت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

ان التكفير له شروط وموانع قد تنتفی فی حق المعين وان تكفير المطلق لا يستلزم تكفير المعين الا اذا وجدت الشروط، وانتفت الموانع.....[1]

''تکفیر کی کچھ شرائط اور موانع ہیں جو کہ کبھی کسی متعین فرد کے حق میں ثابت نہیں ہوتے۔ تکفیر مطلق سے تکفیر معین لازم نہیں آتی اِلاّ یہ کہ تکفیر کی شرائط موجود ہوں اور اس کی راہ میں موانع حائل نہ ہوں''۔

● فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمینؒ اسی نکتے کی توضیح میں رقمطراز ہیں:

فيجب قبل الحكم على المسلم بكفر او فسق ان ينظر فی امرين :احدهما : دلالة الكتاب او السنة على ان هذا القول والفعل موجب للكفر او الفسق. الثانی: انطباق هذا الحكم على القائل المعين او الفاعل المعين بحيث تتم شروط التكفير او التفسيق فی حقه وتنتفی موانعه[2]

''مسلمان پر کفر یا فسق کا حکم عائد کرنے سے پہلے دو باتوں کا پیش نظر رہنا ناگزیر ہے۔ ایک یہ کہ اس کا قول وفعل کتاب وسنت کی رو سے موجب کفر وفسق ہونا چاہیے۔ دوسری یہ کہ اس معین قائل یا فاعل پر اس حکم کا انطباق اس صورت میں ہوگا جب اس کے حق میں تکفیر و تفسیق کی شرائط پوری ہوں اور اس کی راہ میں حائل موانع زائل ہو جائیں''۔

● بعض افراد کو علمائے کرام کے ان اقوال وفتاویٰ سے دھوکہ ہو جاتا ہے جن میں انہوں نے عمومی طور پر بعض اقوال وافعال کے مرتکبین کو کافر وفاسق کہا ہوتا ہے' لہٰذا جب وہ کسی شخص کو ان اقوال وافعال کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو فوراً اسے کافر یا فاسق کہہ دیتے ہیں۔ شیخ الاسلامؒ اس غلط روی کی کجی ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

فاذا رأيت اماما قد غلظ على قائل مقالته' او كفره فيها فلا يعتبر هذا حكما عاما فی كل من قالها' الا اذا حصل فيه الشرط الذی يستحق التغليظ عليه او التكفير له[3]

''جب آپ کسی امام کو کسی قول کے قائل پر سختی کرتے یا اس کی وجہ سے اسے کافر قرار دیتے ہوئے دیکھیں تو اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ حکم ہر اُس شخص کے حق میں عام ہے جو بھی یہ بات کہتا ہے' مگر اس صورت میں جب اس میں وہ شرط پائی جائے جو سختی یا تکفیر کے لیے

ضروری ہو‘‘۔

معین شخص کی تکفیر کے لیے قرآن وسنت سے ثابت شدہ مسلّمہ ضوابط کو ملحوظ رکھنے کے سلسلے میں اہل علم کی توضیحات کے بعد اب وہ شرائط بیان کی جاتی ہیں جن کا کسی متعین فرد پر کفر کا حکم عائد کرنے سے قبل پایا جانا ناگزیر ہے۔

تکفیر معین کی شرائط

علمائے کرام نے کتب عقائد میں یہ شرائط اپنے اپنے ڈھب اور متنوع اسالیب میں واضح کی ہیں۔سطورِ ذیل میں انہیں تہذیب وترتیب سے بیان کیا جارہا ہے۔واللّٰہ الموفق وھو المستعان۔

(۱) قول وفعل کے کفریہ ہونے پر شرعی نص ہو☆

شرائطِ تکفیر میں سے ایک بنیادی ترین شرط یہ ہے کہ جس قول یا عمل کی بنا پر کسی کو کافر کہا جارہا ہے اس کا کفریہ ہونا قرآن وسنت سے ثابت ہو۔اس باب میں کسی قسم کے ذوق ووجدان یا ظن و تخمین پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔اگر کتاب وسنت سے اس قول وفعل کا صریح کفر ہونا متحقق نہ ہو اور اس کے باوجود کسی کو کافر قرار دے دیا جائے تو یہ خدا پر بغیر علم بات کہنے کے مترادف ہوگا‘ جو کہ فعلِ حرام ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِکُوْا بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝۳۳﴾ (الاعراف)

’’(اے نبیؐ!) فرما دیجیے کہ میرے ربّ نے تو صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام کیا ہے جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو پوشیدہ ہوں (سب کو) اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور اس بات کو کہ تم اللہ کا شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور (مزید) یہ کہ تم اللہ پر ایسی باتیں کہو جو تم خود بھی نہیں جانتے۔‘‘

● بعض لوگوں کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ جو ہمیں کافر کہے گا ہم بھی اسے کافر کہیں گے‘ حالانکہ یہ تکفیر کی کوئی شرعی اساس نہیں۔اس کی تردید میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

وھذا بخلاف ما کان یقولہ بعض الناس کابی اسحق الاسفرائینی ومن اتبعہ‘ یقولون : (لا نکفر الا من کفرنا) فان الکفر لیس حقا لھم‘ بل ھو حق اللّٰہ‘ ولیس للانسان ان یکذب علی من یکذب علیہ‘ ولا یفعل الفاحشۃ باھل من فعل الفاحشۃ مع اھلہ‘ بل ولو استکرھہ رجل علی اللواطۃ لم یکن لہ ان یستکرھہ علی ذلک ...... لان ھذا حرام لحق اللّٰہ تعالٰی‘ ولو سب النصاری نبینا‘ لم یکن لنا ان

☆ اس کی کچھ تفصیل پچھلے مضمون میں ’’تکفیر کے ضوابط‘‘ کے تحت پہلے ضابطے ’’قرآن وسنت پر اعتماد کیا جائے گا‘‘ کے زیرِ عنوان گزر چکی ہے۔

*

نسب المسيح علیه السلام' والرافضة اذا کفروا ابابکر وعمر رضی اللّٰہ عنھما' فلیس لنا ان نکفر علیا رضی اللّٰہ عنہ(٤)

''یہ قاعدہ اس قول کے برخلاف ہے جو بعض لوگ کہتے ہیں' جیسے ابواسحٰق اسفرائینی اور ان کے پیروکار' کہ ہم صرف اسی کی تکفیر کرتے ہیں جو ہمیں کافر کہتا ہے' اس لیے کہ کفر کا معاملہ ان کا حق نہیں بلکہ خدا کا حق ہے۔ کسی انسان کو یہ اجازت نہیں کہ اگر کوئی اس پر جھوٹ باندھے تو یہ بھی اس پر جھوٹی بات کہے یا اگر کوئی اس کے اہل سے برائی کرے تو یہ بھی اس کے گھر والوں سے بے حیائی سے پیش آئے۔ بلکہ اگر کوئی اسے لواطت پر مجبور کرے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ یہ بھی اسے اس فعل شنیع پر مجبور کرے۔ کیونکہ یہ حقِ خداوندی ہونے کی بنا پر حرام ہے۔ اسی طرح اگر عیسائی ہمارے پیغمبر ﷺ کو گالی دیں تو ہمیں یہ حق نہیں کہ ہم سیدنا مسیح علیہ السلام کو برا بھلا کہیں اور رافضی اگر سیدنا صدیق اکبر اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کو کافر کہیں تو ہمیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر نہیں کرنی چاہیے۔''

● ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

فلھذا کان اھل العلم والسنة لا یکفرون من خالفھم وان کان ذلک المخالف یکفرھم' اذ الکفر حکم شرعی .... وکذلک التکفیر حق اللّٰہ' فلا یکفر الا من کفرہ اللّٰہ ورسولہ(٥)

''اسی بنا پر اربابِ علم اور اہل سنت اپنے مخالفین کو کافر قرار نہیں دیتے خواہ وہ ان کی تکفیر ہی کیوں نہ کرتے ہوں' کیونکہ کفر ایک شرعی حکم ہے... اسی طرح تکفیر اللہ تعالیٰ کا حق ہے لہٰذا صرف اسی شخص کو کافر کہا جا سکتا ہے جسے خدا اور اس کے رسولؐ نے کافر قرار دیا ہو''۔

● کفر کی تعیین میں عقل کے دخیل ہونے کی نفی کرتے ہوئے علامہ قرافیؒ رقم طراز ہیں:

کون امر ما کفرًا' ای امرٍ کان' لیس من الامور العقلیة' بل ھو من الامور الشرعیة' فاذا قال الشارع فی امر ما' ھو کفر' فھو کفر' سواءً کان ذلک انشاءً ام اخبارًا(٦)

''کسی بھی معاملے کا کفر ہونا عقلی اُمور میں سے نہیں' بلکہ امورِ شرعیہ میں شامل ہے۔ چنانچہ جب شارع کسی امر کے بارے میں کہے کہ یہ کفر ہے تو وہ کفر ہوگا۔ برابر ہے کہ شارع کا قول انشاء کے قبیل سے ہو یا بطریق خبر ہو''۔

● اسی اصول کو امام غزالیؒ یوں واضح کرتے ہیں:

الکفر حکم شرعی کالرق والحریة مثلاً' اذ معناہ' اباحة الدم والحکم بالخلود فی النار ومدرکہ شرعی فیدرک اما بنص واما بقیاس علی منصوص(٧)

''کفر' غلامی اور آزادی کی طرح ایک شرعی حکم ہے' کیونکہ اس کے معنی ہیں خون کا حلال ہونا اور ابدی جہنمی ہونے کا حکم لگانا (جس کی تکفیر کی جا رہی ہے) اور اس کا ادراک شریعت ہی

سے ممکن ہے جو کہ نص سے ہوگا یا پھر منصوص پر قیاس کر کے''۔

علماء نے اس امر کی بھی وضاحت کی ہے کہ تکفیر کے لیے شرعی دلیل کا قطعی ہونا بھی ضروری ہے' یعنی اس میں کسی قسم کا احتمال نہ پایا جائے بلکہ وہ اپنے مفہوم میں بالکل دوٹوک اور واضح ہو۔

● علامہ ابن الوزیرؒ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

ان التکفیر سمعی محض لا مدخل للعقل فیه' وان الدلیل علی الکفر لا یکون الاّ سمعیًا قطعیًا ولا نزاع فی ذلک(۸)

''تکفیر سراسر ایک سمعی☆ (شرعی) معاملہ ہے' اس میں عقل کا کوئی دخل نہیں۔ کفر کی دلیل بھی محض وہی ہوگی جو شرعی اور قطعی ہو اور اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں''۔

● حافظ الغرب علامہ ابن عبد البرؒ رقم طراز ہیں:

فالواجب فی النظر ان لا یکفر الا من اتفق الجمیع علی تکفیره أو قام علی تکفیره دلیل ولا مدفع له کتاب او سنة(۹)

''یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ایسے شخص کے سوا کسی کی تکفیر نہ کی جائے جس پر تمام متفق ہو چکے ہوں یا اس کی تکفیر پر ایسی دلیل موجود ہو جس کے لیے کتاب وسنت میں کوئی رکاوٹ نہ ہو''

● علامہ ابن القیم الجوزیہؒ اپنے شہرۂ آفاق ''قصیدۂ نونیہ''☆☆ میں کہتے ہیں:

الکفر حق اللّٰه ثم رسوله بالنص یثبت' لا بقول فلان

من کان رب العالمین وعبده قد کفراه فذاک ذوالکفران

''کفر اللہ اور اس کے رسولؐ کا حق ہے جو کہ نص سے ثابت ہوتا ہے نہ کہ کسی فلاں کے قول سے۔ جسے پروردگارِ عالم اور اس کا عبدِ خاص (ﷺ) کافر کہیں وہی کافر ہے''۔

● علامہ ابن العثیمینؒ فرماتے ہیں:

الکفر حکم شرعیٌّ مرده الی اللّٰه ورسوله فما دل الکتاب والسنة علی انه کفر فهو کفر' وما دل الکتاب والسنة علی انه لیس بکفر فلیس بکفر' فلیس علی احد بل ولا له ان یکفر احدا حتی یقوم الدلیل من الکتاب والسنة علی کفره(۱۰)

''کفر ایک شرعی حکم ہے جو خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف لوٹایا جائے گا۔ تو جس معاملے کو کتاب وسنت کفر کہیں وہ کفر ہے' جسے یہ کفر قرار نہ دیں وہ کفر نہیں۔ کسی شخص کی یہ ذمہ داری نہیں بلکہ کسی کو یہ حق ہی حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو کافر کہے تا آنکہ اس کے کفر پر قرآن وسنت سے کوئی دلیل موجود ہو''۔

☆ ہم تک پہنچنے کے اعتبار سے شریعت کا دار و مدار چونکہ سماع پر ہے اس لیے شرعی امور و دلائل کو سمعی بھی کہا جاتا ہے۔

☆☆ یہ قصیدہ اہل علم کے ہاں انتہائی مشہور و معروف ہے۔ اس کے ہر شعر کے آخر میں نون آتا ہے اس لیے اسے 'قصیدۂ نونیہ' کہا جاتا ہے۔

*

جلیل القدر ائمہ کرامؒ کی مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات آشکار ہو کر سامنے آ گئی کہ جس قول و فعل کو تکفیر کی بنیاد قرار دیا جائے اس پر شریعت کی قطعی دلیل کا ہونا ضروری ہے‘ جس سے یہ معلوم ہو کہ واقعتاً اس کی وجہ سے کوئی شخص مسلمان نہیں رہتا اور کافر ہو جاتا ہے۔ لیکن فی زمانہ افسوسناک صورت حال یہ ہے کہ خود ساختہ تصورات اور بے اساس نظریات کی بنا پر جن کے بارے میں شریعت سے کوئی قطعی دلیل تو کجا‘ ظنی دلیل بھی موجود نہیں ہوتی‘ دوسروں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے کر مستحقِ قتل گردانا جاتا ہے اور اسے سرِ عام پھانسی دینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے!!

(۲) کفریہ قول و فعل کے مرتکب کی نیت و ارادہ کا اعتبار ہو گا

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایسے الفاظ اپنی زبان پر لے آتا ہے جو درحقیقت کفریہ ہوتے ہیں‘ لیکن اس کا ارادہ اور قصد کفر کا ارتکاب نہیں ہوتا بلکہ اس کی نیت میں ایسا مفہوم ہوتا ہے جس پر کفر کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا‘ تو ایسے شخص کو کافر نہیں کہا جائے گا‘ کہ انسان کے افعال اس کے ارادے کے تابع ہوتے ہیں اور قصد و نیت کا قول و عمل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

اہل علم نے واضح کیا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی بات کہتا ہے جس سے کفریہ معانی نکلتے ہیں‘ لیکن وہ ان معانی کا قصد نہیں رکھتا تو اس پر فتویٔ کفر نہیں لگایا جائے گا۔ مثلاً وہ زمانے کو برا بھلا کہتا ہے‘ جس نے اس کے اور اس کے اعزہ واقارب میں جدائی ڈال دی یا وہ سمجھتا ہے کہ گردش زمانہ سے اس پر مصائب و مشکلات ٹوٹ پڑی ہیں تو اس کا مقصد دراصل اس سبب کو برا بھلا کہنا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اسے تکالیف کا سامنا ہے اور اس کا اعتقاد یہ ہوتا ہے کہ یہ سبب زمانہ ہے۔ لیکن امر واقعہ میں فاعلِ حقیقی خدا کی ذات ہے‘ لہٰذا اس سبّ و شتم کی زد بالواسطہ خدا پر پڑتی ہے‘ جبکہ اس شخص کا یہ ارادہ قطعاً نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا ذہن اس طرف ملتفت ہوتا ہے۔ رسول مکرم ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں اسی جانب اشارہ فرمایا ہے:

((لَا تَسُبُّوا الدَّھْرَ، فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الدَّھْرُ)) (۱۱)

’’دہر (زمانے) کو گالی نہ دو کہ خدا ہی دہر ہے۔‘‘

- شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ:

لا یکفر من سب الدھر (۱۲)

’’جو زمانے کو برا بھلا کہے اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔‘‘

اور اس کی وجہ یہی بیان کی ہے کہ ایسا کہنے والے کا قصد یہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ایسا کہنے والے کو کچھ بھی نہیں کہا جائے گا‘ بلکہ اسے تنبیہہ و سرزنش کی جائے گی اور اس پر تعزیری سزا بھی نافذ کی جا سکتی ہے۔ شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں:

فقد نهی النبیﷺ عن هذا القول وحرّمه ولم یذکر کفرًا ولا قتلاً والقول المحرم یقتضی التعزیر والتنکیل(۱۳)

''نبی مکرمﷺ نے اس بات سے روکا ہے اور اسے حرام قرار دیا ہے' لیکن کفر یا قتل کرنے کا ذکر نہیں فرمایا اور حرام شدہ قول تعزیر اور عبرتناک سزا کا متقاضی ہے۔''

اسی طرح اگر کوئی شخص عمومی طور پر تمام انسانوں پر سبّ و شتم کرتا ہے جس میں دیگر انسانوں کی طرح انبیاء کرام علیہم السلام بھی داخل ہیں اور وہ اس میں انبیاء کرامؑ کا قصد نہیں رکھتا تو اس کو بھی کافر نہیں کہا جائے گا۔

● امام کرمانیؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا کہ ایک شخص نے دوسرے پر جھوٹی تہمت لگائی اور کہا کہ **یا ابن کذا وکذا الی آدم و حوا** یعنی آدم و حوا علیہما السلام تک ......تو امام احمدؒ نے اسے بہت بڑی جسارت سمجھا اور فرمایا: **نسال اللّٰه العافیة' لقد اتی هذا عظیما** ''ہم خدا سے عافیت کا سوال کرتے ہیں کہ اس نے بڑی جسارت کا ارتکاب کیا ہے''۔ پھر امام صاحب سے سوال کیا گیا کہ کیا اس پر حد جاری ہوگی؟ تو فرمایا: **لم یبلغی فی هذا شیء** ''مجھے اس سلسلے میں کوئی شرعی دلیل نہیں پہنچی''۔

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ:

فلم یجعل احمد — رضی اللہ عنہ — بهذا القول کافرًا' مع ان اللفظ یدخل فیه نوح وادریس وشیث وغیرهم من النبیین' لان الرجل لم یدخل آدم و حوا فی عمومه' وانما جعلهما غایةً وحدًا لمن قذفه' والالو کانا من المقذوفین تعین قتله بلاریب(۱۴)

''امام احمدؒ نے اس قول کی وجہ سے اسے کافر قرار نہیں دیا باوجودیکہ اس میں سیدنا نوح' ادریس' شیث اور دیگر انبیاء علیہم السلام بھی داخل ہوتے ہیں' کیونکہ اس شخص نے اس عموم میں سیدنا آدم وحوا علیہما السلام کو داخل نہیں کیا بلکہ ان کو اس شخص کے لیے آخری حد اور غایت قرار دیا ہے جس پر تہمت لگائی جارہی ہے' اور اگر آدم وحوا بھی ان لوگوں میں شامل ہوتے کہ جن پر اس نے تہمت لگائی ہے تو بغیر کسی شک وشبہ کے اس کا قتل متعین ہوجاتا''۔

● اس اصول کی تائید قرآن شریف سے بھی ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا﴾ (البقرة:۱۰۴)

''اے اہل ایمان! راعنا نہ کہا کرو''۔

اس آیت مبارکہ کا پس منظر یہ ہے کہ بد بخت یہودی رسول معظمﷺ کی بے ادبی کرتے ہوئے آپؐ کو ایذا پہنچانے کے لیے لفظ 'راعنا' کہہ کر مخاطب کرتے۔ ان کا مقصود گستاخی ہوتا تھا' کیونکہ عبرانی زبان میں یہ لفظ ایسے ہی معنی کے لیے مستعمل تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی یہ لفظ استعمال کرتے تھے' لیکن ان کے ذہن میں اس کا یہ مطلب ہوتا کہ ہماری رعایت فرمائیے' تو اس پر اللہ تعالیٰ نے

*

اس لفظ کا استعمال ہی ممنوع فرما دیا تا کہ آپؐ کی توہین و تنقیص کا ہر باب بند کر دیا جائے۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس لفظ کے بولنے سے منع تو فرمایا‘ لیکن انہیں کافر قرار نہیں دیا۔ اس سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جب مسلمان کسی لفظ سے کوئی درست معنی مراد لے اور وہ اس لفظ کی دلالت سے صحیح طور پر باخبر نہ ہو کہ اس میں اہانت کے معنی بھی پائے جاتے ہیں تو اس کی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔ واللہ اعلم!

✡ ظاہر و باطن میں تعلق کا مسئلہ

تکفیر معین کی شرائط کے تحت اصولِ زیر بحث سے متعلق ایک انتہائی اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ ظاہر و باطن کا آپس میں تعلق کس نوعیت کا ہے؟ اس باب میں تین زاویہ ہائے نگاہ پائے جاتے ہیں:

● پہلا یہ کہ ظاہر و باطن میں مطلقاً تلازم پایا جاتا ہے‘ یعنی جو ظاہر میں ہوگا لازمی طور پر باطن میں بھی وہی سمجھا جائے گا‘ یعنی ظاہر‘ باطن کے لیے ایک آئینے کی مانند ہے۔ اس میں وہی نظر آتا ہے جو باطن میں چھپا ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ظاہری طور پر بعض اعمالِ شرک کا مرتکب نظر آتا ہے تو وہ باطن میں بھی مشرک ہی گردانا جائے گا اور اس سلسلے میں شرائط و موانع کی جانب توجہ نہیں دی جائے گی۔ اسی طرح اس نقطۂ نگاہ کے مطابق اعمالِ شرک کو ترک کر دینا ہی اصل دین کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ المختصر اس رائے کے مطابق ظاہر و باطن ایک ہی حقیقت کی دو صورتیں ہیں۔

● دوسرا موقف یہ ہے کہ ظاہر اور باطن میں سرے سے تلازم پایا ہی نہیں جاتا۔ اس کی پشت پر یہ اصول کارفرما ہے کہ ایمان محض تصدیق کا نام ہے اور اس کے ثبوت کے لیے عمل ضروری نہیں۔ ظاہری طور پر انسان کوئی عمل کرے نہ کرے باطنی طور پر اگر وہ تصدیق کرتا ہو تو اس کا ایمان کامل ہوگا‘ یعنی عمل کا کوئی لحاظ نہیں‘ حتیٰ کہ اگر عمل معصیت و نافرمانی اور کفر و شرک ہی پر کیوں نہ مبنی ہو‘ ایمان پر قطعاً اثر انداز نہ ہوگا۔

● تیسرا طرزِ فکر اہل سنت والجماعت کا ہے‘ جو افراط و تفریط پر مبنی مندرجہ بالا دونوں انتہاؤں کے مابین انتہائی معتدل و متوازن حیثیت کا حامل ہے۔ اہل سنت نہ تو علی الاطلاق ظاہر و باطن میں تلازم کے قائل ہیں اور نہ اس کا بالکل انکار کرتے ہیں۔ اہل السنۃ والجماعۃ کے مطابق ظاہر و باطن میں تعلق کی چار صورتیں یا حالتیں ہیں:

پہلی حالت: باطن میں کفر ہو لیکن ظاہری عمل اس پر دلالت نہ کرے

یہ صورت اعتقادی منافقین پر منطبق ہوتی ہے جو باطن میں کفریہ اعتقاد رکھتے ہیں‘ لیکن ظاہری طور پر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کا باطن کفر اور ظاہر اسلام ہے۔ کیونکہ زبان

سے اسلام کا اقرار بھی کرتے ہیں اور شریعت کے مقرر کردہ اعمال بھی بجا لاتے ہیں۔ یہاں دو باتیں قابل توجہ ہیں:

اولاً یہ کہ یہ لوگ حقیقۃ الامر کے اعتبار سے کافر ہیں' بلکہ دوسرے کفار سے بھی بدتر ہیں اور ان کا اقرار و عمل روزِ قیامت اُن کے لیے قطعاً مفید نہ ہوگا۔

ثانیاً یہ کہ حقیقی طور پر کافر ہونے کے باوجود ان پر کفر کا حکم نہیں لگایا جا سکتا' کیونکہ حالاتِ قلب پر مطلع ہونا سوائے خدا کے کسی اور کے لیے ممکن نہیں' یا پھر جسے باری تعالیٰ بذریعہ وحی خبر دے' جیسے انبیاء کرام علیہم السلام۔ اس سلسلے میں سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ کا قصہ مشہور ہے کہ انہوں نے ایک کلمہ پڑھنے والے کو اس احتمال کی وجہ سے قتل کر دیا کہ شاید وہ جان بچانے کے لیے ایسا کر رہا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل پر اظہارِ ناراضی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟ یعنی اگر کوئی ظاہراً اپنے آپ کو مسلمان کہے تو اسی کا اعتبار ہوگا۔ ☆

دوسری حالت: ظاہر کی دلالت باطن پر قطعی ہو

یعنی ظاہری قول و عمل ایسا کفریہ ہو جس میں کسی احتمال کی گنجائش نہ ہو۔ اس سے مراد ایسا عمل ہے جو فی نفسہٖ کفر ہے اور اس کے لیے کسی قسم کی نیت یا قصد معتبر نہیں' مثلاً کوئی اللہ تعالیٰ یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سبّ و شتم کرے تو یہ صریح کفر ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ان سب اللّٰہ اوسب رسولہ کفر ظاھرًا وباطنًا وسواء کان الساب یعتقد ان ذلک محرمٌ او کان مستحلاً لہ او کان ذاھلًا عن اعتقادہ ھذا مذھب الفقھاء وسائر اھل السنۃ القائلین بان الایمان قول و عمل(۱۵)

☆ منافقوں کی ایک قسم 'زندیق' بھی ہے۔ یہ اپنے کفر کو وقتاً فوقتاً ظاہر کرتے رہتے ہیں' لیکن پوچھ گچھ کرنے پر فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ ان کے بارے میں علماء کے ہاں دو آراء پائی جاتی ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔ (الام للشافعیؒ: ۱۷۱/۱۶) جبکہ بعض علماء کہتے ہیں کہ ایسے شخص کی توبہ قابل قبول نہیں' کیونکہ اس کا بار بار اظہارِ کفر توبہ کو باطل کر دیتا ہے۔ امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ اسی کے قائل ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا بھی ایک قول یہی ہے۔ (الصارم المسلول از ابن تیمیہؒ: ۳۴۵/۲ نیز اعلام الموقعین از ابن القیمؒ: ۱۳۱/۳) زندیق کی تعریف بعض اہل علم نے یہ کی ہے کہ وہ اپنے کفریہ عقائد و نظریات کو اسلام ثابت کرنے پر مصر ہو' جیسے قادیانی ہیں کہ ختم نبوت کے انکار کو بھی اسلام باور کراتے ہیں۔ (تحفۂ قادیانیت' از مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ' ص ۶۶۵) نیز مفتی اعظم مولانا محمد شفیعؒ نے بھی زندیق کے مفہوم پر بحث کی ہے۔ (ملاحظہ ہو جواھر الفقہ: ۲۸/۱ ومابعد)۔

*

''بلاشبہ باری تعالیٰ یا رسول معظم ﷺ کو گالی دینا ظاہری و باطنی ہر دو اعتبار سے کفر ہے۔ برابر ہے کہ اس فعل شنیع کا مرتکب اس کے حرام ہونے کا اعتقاد رکھتا ہو یا اسے حلال گردانتا ہو یا پھر اپنے اعتقاد سے غافل ہو گیا ہو۔ یہی فقہاء کرام اور تمام اہل سنت کا مذہب ہے جو اس امر کے قائل ہیں کہ ایمان قول و عمل کا نام ہے۔''

اس کے متصل بعد شیخ الاسلام ایک جلیل القدر امام' ابو یعقوب اسحاق بن ابراہیم الحنظلی کا قول نقل کرتے ہیں' (جو ابن راہویہ کے نام سے معروف ہیں اور امام شافعیؒ و احمد بن حنبلؒ کے ہم مرتبہ ہیں) کہ انہوں نے فرمایا:

قد اجمع المسلمون ان من سب اللّٰہ اوسب رسولہ ﷺ او دفع شیئا مما انزل اللّٰہ او قتل نبیا من انبیاء اللّٰہ انہ کافر بذلک وان کان مقرًا بکل ما انزل اللّٰہ (ایضاً)

''تمام مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ یا اس کے رسولؐ کو گالی دے یا خدا کی نازل کردہ شریعت میں سے کسی شے کو رد کرے یا پیغمبرانِ خدا میں سے کسی ایک کو قتل کردے تو اس کی وجہ سے وہ کافر ہو جائے گا' اگرچہ وہ خدا کے اُتارے ہوئے تمام احکامات کا اقراری ہی کیوں نہ ہو۔''

الغرض اللہ رب العزت یا حضور نبی مکرم ﷺ کو برا بھلا کہنا از خود ایک کفریہ عمل ہے اور اس پر حکم لگانے کے لیے قصد و ارادہ کی طرف دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں☆۔

● اسی طرح اگر کوئی اللہ تعالیٰ' رسول معظم ﷺ یا شعائر دین کا مذاق اڑاتا ہے تو یہ بھی کافر سمجھا جائے گا کہ استہزاء فی نفسہٖ کفر ہے اور اس سلسلے میں نیت وغیرہ معتبر نہیں۔ قرآن کریم میں منافقین کا طرزِ عمل بیان ہوا ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ کا مذاق اڑاتے' آیاتِ الٰہی کا استہزاء کرتے اور مؤمنین سے ٹھٹھہ کرتے اور جب ان سے پوچھ گچھ کی جاتی تو کہتے:

﴿**اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ**ؕ﴾ (التوبة:٦٥)

''ہم تو (آپس میں) یونہی ہنس بول رہے تھے''۔

ان کے اس عذرِ لنگ کے جواب میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

﴿**قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝٦٥ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ**ؕ﴾ (التوبة:٦٦)

''فرما دیجیے کہ اللہ' اس کی آیتیں اور اس کا رسول ہی تمہارے ہنسی مذاق کے لیے رہ گئے

☆ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب ''**الصارم المسلول علی شاتم الرسولؐ**'' میں اس پر بڑی مفصل اور نفیس بحث کی ہے اور اس کی تائید میں بہت سے ائمہ دین کے اقوال و آثار نقل کرنے کے ساتھ ساتھ بعض لوگوں کے اس غلط نظریے کی بھی مدلل و مسکت تردید کی ہے کہ خدا تعالیٰ یا رسول اکرم ﷺ کے شاتم کی بھی نیت دیکھی جائے گی اور بعد ازاں اس پر حکم لگایا جائے گا۔

ہیں؟ تم بہانے نہ بناؤ' یقیناً تم اپنے ایمان کے بعد بے ایمان ہو گئے ہو''۔

ائمہ مجتہدین نے اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑانے والے کو کافر کہا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

كذلك نقل عن الشافعي انه سئل عمن هزل بشيء من آيات الله تعالىٰ انه قال هو كافر' واستدل بقول الله تعالىٰ ﴿قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ۝۶۵ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ﴾ (التوبة:٦٦) (١٦)

''اس طرح امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ ان سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا گیا کہ اس نے آیاتِ خداوندی کا کچھ استہزاء کیا ہے تو فرمایا کہ وہ کافر ہے اور پھر انہی آیتوں سے استدلال کیا۔''☆

تیسری حالت: ظاہری فعل میں کفر اور عدم دونوں کا احتمال ہو

بعض افعال ایسے ہوتے ہیں جن کی دلالت کفر پر قطعی نہیں ہوتی' لہٰذا ضروری ہے کہ اس طرح کے افعال کا ارتکاب کرنے والے کی مراد معلوم کی جائے اور اُس وقت تک اس پر کفر کا حکم نہ لگایا جائے جب تک وہ اس فعل سے کفر کا قصد نہ رکھتا ہو۔ درج ذیل دو مثالوں سے یہ اصول واضح ہو جائے گا۔

☆ **پہلی مثال**: سیدنا حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بہت معروف ہے کہ جب غزوۂ فتح مکہ کے موقع پر رسول اکرم ﷺ نے لشکر اسلام کی روانگی کو خفیہ رکھنے کا پروگرام بنایا تو سیدنا حاطبؓ نے قریش کو ایک رقعہ لکھ کر یہ اطلاع دے بھیجی کہ رسول اللہ ﷺ حملہ کرنے والے ہیں۔ انہوں نے یہ رقعہ ایک عورت کو دیا تھا اور اسے قریش تک پہنچانے پر معاوضہ رکھا تھا۔ یہ عورت رقعہ لے کر روانہ ہوئی' لیکن نبی مکرم ﷺ کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع ہوئی۔ آپؐ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں بعض صحابہؓ کو اس کے تعاقب میں بھیجا' جنہوں نے اسے جا لیا اور وہ رقعہ اس سے برآمد کر لیا۔ خط رسول اکرم ﷺ کے پاس پہنچا تو آپؐ نے حضرت حاطبؓ کو بلا کر پوچھا کہ حاطبؓ! یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا! اے رسولؐ! میرے خلاف جلدی نہ فرمائیں۔ خدا کی قسم! اللہ اور اس کے رسولؐ پر میرا ایمان ہے۔ میں نہ تو مرتد ہوا ہوں اور نہ مجھ میں تبدیلی آئی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں خود قریش کا آدمی نہیں۔ البتہ ان میں چپکا ہوا تھا اور میرے اہل وعیال اور بال بچے

☆اس کی روشنی میں آج ہمیں اپنے طرزِ عمل کا محاسبہ کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ ہنسی مذاق اور لطیفوں کے نام پر اللہ' رسولؐ' ملائکہ اور دیگر شعائر دینیہ کا استہزاء ایک معمولی چیز سمجھا جاتا ہے اور بطورِ خاص بھانڈ اور میراثی قسم کے لوگ مختلف تقریبات میں اس طرح کے بے ہودہ لطیفے سنا کر سامعین و حاضرین سے پیسے بھی بٹورتے ہیں اور داد بھی پاتے ہیں' حالانکہ یہ کھلا کفر ہے۔ نعوذ باللہ۔

*

وہیں ہیں۔ لیکن قریش سے میری کوئی قرابت نہیں کہ وہ میرے بال بچوں کی حفاظت کریں۔ اس کے برخلاف دوسرے لوگ جو آپؐ کے ساتھ ہیں وہاں ان کے قرابت دار ہیں جو اُن کی حفاظت کریں گے۔ اس لیے جب مجھے یہ چیز حاصل نہ تھی تو میں نے چاہا کہ ان پر ایک احسان کر دوں جس کے عوض وہ میرے قرابت داروں کی حفاظت کریں۔ اس پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! مجھے چھوڑیے میں اس کی گردن مار دوں‘ کیونکہ اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ خیانت کی ہے اور یہ منافق ہو گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھو! یہ جنگ بدر میں حاضر ہو چکا ہے اور عمر! تمہیں کیا پتہ؟ ہوسکتا ہے اللہ نے اہل بدر کو دیکھ کر کہا ہو کہ تم لوگ جو چاہو کرو‘ میں نے تمہیں بخش دیا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور انہوں نے کہا اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔(۱۷)

سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ کا یہ عمل عمومی طور پر تو موالاۃِ کفار میں آتا ہے‘ لیکن اس کی دلالت حتمی اور قطعی نہیں‘ بلکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ انہوں نے کسی اور وجہ سے یہ عمل کیا ہو‘ جیسا کہ خود انہوں نے صراحت کر دی‘ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کفر قرار نہیں دیا‘ ورنہ محض بدر میں حاضر ہونے سے یہ معاف نہ ہوسکتا‘ کیونکہ کفر سے تمام اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ﴾ (المائدۃ:۵)

’’اور منکرین ایمان کے اعمال ضائع اور اکارت ہیں۔‘‘

یہ عمل چونکہ نیت اور قصد کی بنا پر کفر کے بجائے ایک معصیت تھا‘ اسی لیے بدر میں حاضر ہونے کی وجہ سے معاف ہو گیا۔

امام محمد بن ادریس الشافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ’’الاُم‘‘ میں اس واقعے کی روشنی میں تفصیلی بحث کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ جب فعل میں کفر اور عدم کفر کا احتمال ہو تو فاعل کے قصد و ارادہ کی تفتیش کے بعد ہی اس پر حکم لگایا جائے گا۔(۱۸)

☆ **دوسری مثال**: سیدنا عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

لَمَّا قَدِمَ مُعَاذٌ مِنَ الشَّامِ سَجَدَ لِلنَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((مَا هٰذَا يَا مُعَاذُ؟)) قَالَ اَتَيْتُ الشَّامَ فَوَافَقْتُهُمْ يَسْجُدُوْنَ لِاَسَاقِفَتِهِمْ وَبَطَارِقَتِهِمْ‘ فَوَدِدْتُ فِيْ نَفْسِيْ اَنْ نَفْعَلَ ذٰلِكَ بِكَ. فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم: ((فَلَا تَفْعَلُوْا فَاِنِّيْ لَوْ كُنْتُ اٰمِرًا اَحَدًا اَنْ يَسْجُدَ لِغَيْرِ اللّٰهِ لَاَمَرْتُ الْمَرْأَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا))(۱۹)

جب معاذؓ شام سے آئے تو انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ’’معاذؓ! یہ کیا؟‘‘ انہوں نے کہا: میں شام گیا تو میں نے وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پادریوں اور سرداروں کو سجدہ کرتے ہیں۔ مجھے اپنے دل میں یہ بات اچھی لگی کہ ہم آپؐ کے ساتھ

(تعظیم اور احترام کا) یہ طریقہ اختیار کریں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم یہ (کام) نہ کرو۔ اگر میں کسی کو اللہ کے سوا کسی کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کیا کرے۔''

سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے رسولِ معظم ﷺ کو تعظیماً سجدہ کیا تھا' کیونکہ انہوں نے اہل کتاب کو اپنے علماء اور مذہبی پیشواؤں کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کا مقصد قطعاً نبی اکرم ﷺ کی عبادت نہ تھا اور نہ ہی ایسا حصول تقرب مقصود تھا جیسا کہ خدا تعالیٰ کو سجدہ کر کے حاصل کیا جاتا ہے' بلکہ ان کے پیش نظر محض اظہار تعظیم و توقیر تھا۔ لیکن رسول اکرم ﷺ نے ازراہِ تعظیم بھی ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ یہ سجدۂ تعظیمی کا نسخ تھا۔ پہلی شریعتوں میں یہ جائز تھا جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں اور والدین نے انہیں سجدہ کیا تھا۔ اسی طرح فرشتوں نے حسبِ حکم خداوندی سیدنا آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا۔ یہ سجودِ عبادت نہ تھے بلکہ تعظیم و تکریم کے لیے تھے۔

رئیس المفسرین امام ابن کثیرؒ ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ......﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وقال بعض الناس كان هذا سجود تحية وسلام واكرام' كما قال تعالى: ﴿وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ﴾ (یوسف: ۱۰۰) وقد كان هذا مشروعا فى الامم الماضية ولكنه نسخ فى ملتنا. [۲۰]

''بعض لوگوں کا قول ہے کہ یہ سجدہ سلام اور عزت و اکرام کا تھا جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمان ہے کہ انہوں نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھالیا اور سب کے سب سجدہ میں گر پڑے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا' ابا! یہی میرے اس خواب کی تعبیر ہے' جسے میرے ربّ نے سچا کر دکھایا' پہلی اُمتوں میں یہ جائز تھا' لیکن ہمارے دین میں یہ منسوخ ہو گیا۔''

اس کے بعد امام ابن کثیرؒ نے حضرت معاذؓ کی مذکورہ بالا حدیث بیان کی ہے۔

● علامہ شوکانیؒ نے سیدنا معاذؓ کی مذکورہ حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ:

وفى هذا الحديث دليل على ان من سجد جاهلاً لغير الله لم يكفر [۲۱]

''اس حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ جہالت کی بنا پر غیر اللہ کو سجدہ کرنے والے کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ محض سجدہ فی نفسہٖ عبادت نہیں اور اگر کوئی خدا کے علاوہ کسی اور کے سامنے سربسجود ہوتا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ اس کی عبادت کرنے والا ہی سمجھا جائے۔ وہ سجدہ کرنے کی وجہ سے مشرک نہیں ہوگا الّا یہ کہ اس سجدے سے اس کا ارادہ عبادت یا تقرب کا حصول ہو۔ رہا مجرد سجدہ تو یہ ممانعت کے بعد حرام تو ہے لیکن شرک نہیں' کیونکہ شرک جواز اور نسخ کا احتمال

*

نہیں رکھتا۔ نسخ صرف شرائع میں ہوتا ہے۔

● شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ مذکورہ مسئلے پر مفصل گفتگو کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

فکیف یقال یلزم من السجود لشیء من عبادته وقد قال النبی ﷺ: ((لَوْ کُنْتُ آمِرًا اَحَدًا اَنْ یَسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَۃَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِھَا لِعَظْمِ حَقِّہٖ عَلَیْھَا)) ومعلوم انه لم یقل لو کنت آمرا احدا ان یعبد (۲۲)

''یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ کسی شے کو سجدے کرنے سے اس کی عبادت لازم آتی ہے' جبکہ رسول اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ اگر میں کسی عورت کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت سے کہتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے کہ وہ اس پر بہت حق رکھتا ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر میں کسی کو عبادت کا حکم دیتا''۔

الغرض سجدہ چونکہ عبادت پر قطعی دلالت نہیں رکھتا اس لیے اس کی بناء پر کسی معین شخص کی تکفیر نہیں کی جا سکتی تا آنکہ اس کا ارادہ معلوم ہو جائے۔ لہٰذا وہ اُمور جو صرف خدا کے لیے خاص ہیں اور ان کا کسی اور کے لیے بجا لانا درست نہیں وہی شرک سمجھے جائیں گے۔ ان امور کو ایسے معاملات سے الگ اور متمیز کرنا ضروری ہے جو اللہ کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی جائز ہیں' یا کسی زمانے میں رہے ہیں۔

● اس نکتے کی توضیح میں شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں:

اما الخضوع والقنوت بالقلوب والاعتراف بالربوبیة والعبودیة فھذا لا یکون علی الاطلاق الا للّٰہ سبحانه وتعالیٰ وحده وھو فی غیره ممتنع باطل. واما السجود فشریعة من الشرائع' اذا امرنا اللّٰہ ان نسجد له' ولو امرنا ان نسجد لاحد من خلقه غیره لسجدنا لذلک الغیر' طاعة للّٰہ عزوجل' اذا احب ان نعظم من سجدنا له' ولو لم یفرض علینا السجود لم یجب البتة فعله' فسجود الملائکة لآدم عبادة للّٰہ وطاعة له' وقربة یتقربون بھا الیه' وھو لآدم تشریف وتکریم وتعظیم وسجود اخوة یوسف له تحیة و سلام' الا تری ان یوسف لو سجد لابویه تحیة لم یکره له (۲۳)

''جہاں تک دلی فروتنی' قلبی اطاعت اور ربوبیت وعبادت کے اعتراف کا معاملہ ہے تو یہ علی الاطلاق محض اکیلے خدا تعالیٰ ہی کے لیے ہو سکتا ہے خدا کے علاوہ کسی اور کے لیے یہ قطعی ممنوع و باطل ہے۔ رہا سجدہ تو یہ منجملہ اُمورِ شریعت میں سے ہے۔ جب باری تعالیٰ ہمیں حکم فرمائے گا' ہم اسے سجدہ کریں گے اور اگر وہ ہمیں اپنے علاوہ مخلوق میں سے کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دے تو ہم اطاعتِ خداوندی میں اسے سجدہ کریں گے' کیونکہ خدا چاہتا ہے کہ ہم اس کی تعظیم کریں جسے سجدہ کیا جا رہا ہے۔ اگر باری تعالیٰ ہم پر سجدہ فرض نہ کرتا تو اسے بجا لانا بالکل ضروری نہ ہوتا۔ سیدنا آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ خدا کی عبادت اور اطاعت تھا جس کے ذریعہ وہ اس کا قرب حاصل کرتے تھے اور سیدنا آدمؑ کے لیے وہ سجدہ شرف اور تعظیم و تکریم کا باعث تھا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے سامنے ان کے بھائیوں کا سربسجود ہونا سلام کے لیے تھا۔

کیا آپ نہیں سمجھتے کہ اگر سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے والدین کو بطور تحیہ وسلام سجدہ کرتے تو ان کے لیے ناپسندیدہ نہ ہوتا''۔

☆ خلاصہ یہ کہ سجدہ چونکہ فی نفسہٖ عبادت پر قطعی دلالت نہیں رکھتا بلکہ اس کے فاعل کی نیت و ارادہ سے اس کی نوعیت متعین ہوتی ہے کہ یہ عبادت کے لیے ہے یا تعظیم و تکریم اور سلام کے لیے' لہٰذا غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے انسان لازماً کافر نہ ہوگا' الا کہ عبادت کی نیت سے کرے۔ لیکن یہاں یہ بھی پیش نظر رہے کہ اگر حرمت کا علم رکھتے ہوئے اور غیر اللہ کے لیے حلال سمجھے بغیر کوئی کسی کو سجدہ کرتا ہے تو وہ فعل حرام کا مرتکب ہونے کی بنا پر گناہگار ہوگا اور عنداللہ مستحق عذاب ہوگا۔ عصر حاضر میں بعض لوگوں کے مزارات اور قبورِ صالحین پر سجدوں کو بھی اسی اصول کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔ البتہ بت کو سجدہ کرنا کفر ہوگا' کیونکہ یہ عبادت کے لیے ہی ہوتا ہے۔

دوسرا نقطہ نظر : یہاں یہ وضاحت بھی مناسب رہے گی کہ اسلاف میں سے کثیر علماء کی اگرچہ یہی رائے ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ لیکن یہ متفقہ موقف نہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا مطلقاً کفر و شرک ہے چاہے نیت جو بھی ہو۔ جلیل القدر حنفی امام شمس الائمہ السرخسی 'المبسوط' میں فرماتے ہیں: **من سجد لغیر اللّٰہ تعالی علی وجہ التعظیم کفر** ''جس نے غیر اللہ کو تعظیم کے طور پر سجدہ کیا' وہ کافر ہو گیا''۔ علامہ ابن عابدین الشامیؒ لکھتے ہیں: **یکفر بالسجدۃ مطلقًا** (٢٤) ''سجدہ کرنے سے علی الاطلاق کافر ہو جائے گا''۔

مجدد الف ثانیؒ کو پتہ چلا کہ ایک صاحب کو ان کے عقیدت مند سجدۂ تحیہ کرتے ہیں اور وہ انہیں روکنے میں سختی نہیں کرتے تو مجددؒ نے ان صاحب کو لکھا کہ ''میرے بھائی سجدہ جو زمین پر پیشانی رکھنے سے عبارت ہے' غایت درجے کے عجز و انکسار والا عمل ہے' اسی لیے یہ عبادتِ ربّ کے لیے خاص کر دیا گیا ہے اور اس کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں۔(٢٥) شاہ اسماعیل شہیدؒ کا بھی یہی نقطہ نگاہ ہے۔ اسی طرح سعودی عرب کی فتویٰ کمیٹی نے بھی کئی سوالات کے جواب میں اسی موقف کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً کمیٹی سے سوال ہوا کہ ایک شخص اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ خدا ہی خالق و رازق ہے اور محمدؐ رسول خدا ہیں اور سوائے نماز کے اور کچھ نہیں کرتا تو ایسا شخص اگر اپنے شیوخ کو سجدہ کرے اور غیر اللہ کے لیے جانور ذبح کرے تو کیا وہ مسلمان ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ''غیر اللہ کو سجدہ اور اس کے لیے ذبح کرنا شرک ہے اور جو ان کے شرک ہونے کے بیان کے بعد ایسا کرے تو وہ مشرک و کافر ہے۔ خدا اس کا فرض قبول کرے گا نہ نفل اگرچہ وہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے۔ کیونکہ مشرک کے اعمال قابل قبول نہیں''۔ ملخصاً(٢٦)

چوتھی حالت: فعل کفریہ اور فاعل کے قصد میں احتمال ہو

اس صورت میں فعل اور فاعل کا حکم الگ الگ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ کوئی فعل تو شریعت کی رو

*

سے کفر ہوتا ہے لیکن اس کے مرتکب کا قصد و ارادہ اس کے مطابق نہیں ہوتا۔ ایسی صورتحال میں دیکھا جائے کہ کہیں کوئی ایسا مانع تو موجود نہیں جس کی بنا پر یہ شرعی دلائل کی مخالفت کا مرتکب ہوا ہے' چنانچہ اگر کوئی مانع پایا گیا تو اسے کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔☆ یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ یہ اصول ان امور سے متعلق ہے جو عقیدہ و عمل کی تفصیلات و جزئیات سے تعلق رکھتے ہیں' جہاں تک ان معاملات کا تعلق ہے جو شہادتین (توحید و رسالت) کے صریح منافی ہوں تو ان میں ایسے شخص کو معذور نہیں سمجھا جائے گا جیسے یہ عقیدہ رکھنا کہ خدا کے ساتھ کوئی اور شریک بھی ہوسکتا ہے' یا عبادت کے ذریعے کسی اور کا قرب حاصل کرنا درست ہے' یا انسان کے لیے شرعی احکام سے روگردانی جائز و درست ہے' یا یہ کہ قرآن شریف صرف عربوں کے لیے نازل ہوا اور دیگر لوگوں کے لیے اس پر ایمان لانا ضروری نہیں وغیرہ۔ لیکن ایسے امور جو جزئیات سے متعلق ہیں' اگر وہ جہالت یا کسی شبہے کی بنا پر ان کا انکار کر دیتا ہے تو کافر نہ ہوگا۔ اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

☆ پہلی دلیل : متفق علیہ حدیث میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كَانَ رَجُلٌ يُسْرِفُ عَلٰى نَفْسِهٖ ، فَلَمَّا حَضَرَهُ الْمَوْتُ قَالَ لِبَنِيْهِ، إِذَا اَنَا مُتُّ فَاَحْرِقُوْنِيْ ثُمَّ اطْحَنُوْنِيْ ثُمَّ ذَرُّوْنِيْ فِي الرِّيْحِ. فَوَ اللّٰهِ لَئِنْ قَدَرَ اللّٰهُ عَلَيَّ لَيُعَذِّبَنِيْ عَذَابًا مَا عَذَّبَهٗ اَحَدًا فَلَمَّا مَاتَ فُعِلَ بِهٖ ذٰلِكَ فَاَمَرَ اللّٰهُ الْاَرْضَ فَقَالَ اجْمَعِيْ مَافِيْكِ مِنْهُ فَفَعَلَتْ فَإِذَا هُوَ قَائِمٌ، فَقَالَ : مَا حَمَلَكَ عَلٰى مَا صَنَعْتَ؟ قَالَ: يَا رَبِّ خَشْيَتُكَ فَغَفَرَلَهٗ))[٢٧]

''ایک شخص بہت گناہ کیا کرتا تھا' مرتے وقت اپنے بیٹوں سے کہنے لگا' جب میں مر جاؤں تو مجھ کو جلا ڈالنا' پھر (ہڈیاں) خوب پیسنا' پھر ہوا میں اڑا دینا' بخدا اگر پروردگار نے مجھے پکڑ لیا تو ایسا عذاب دے گا جو کسی کو نہ دیا ہوگا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے بیٹوں نے یہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا جو کچھ (اس کے بدن کے اجزاء) تجھ میں ہیں' وہ سب جمع کر' زمین نے اکٹھے کر دیا۔ وہ سامنے کھڑا ہوا' باری تعالیٰ نے پوچھا: ارے تو نے کیا کیا؟ وہ بولا خداوند تیرے ڈر سے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔''

اس شخص کا گمان تھا کہ اسے جلا کر بکھیر دیے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اسے پکڑ نہیں سکیں گے۔ باوجودیکہ یہ قدرتِ خداوندی کا انکار ہے' لیکن شبہ کی وجہ سے اس کا یہ انکار تکذیب پر مبنی نہ تھا اور اس کا تعلق بھی عقیدے کی تفصیلات سے ہے۔ اس لیے وہ کافر نہیں' کیونکہ کسی عقیدے یا عمل کے کفر و شرک ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مرتکب لازمی طور پر کافر ہی قرار دیا جائے گا بلکہ اس کے لیے شرائط کی موجودگی اور موانع کا زائل ہونا ضروری ہے اور یہاں ایک مانع یعنی جہالت و لاعلمی موجود ہے۔

● شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:

☆ وہ اُمور جو تکفیر کے لیے موانع کی حیثیت رکھتے ہیں' ان کا ذکر تکفیر معین کے موانع کے زیرعنوان آگے تفصیلاً آئے گا۔ اِن شاء اللہ۔

هذا الرجل ظن ان اللّٰه لا يقدر عليه اذا تفرق هذا التفرق فظن انه لا يعيده اذا صار كذلک، وكل واحد من انكار قدرة اللّٰه تعالىٰ، وانكار بعاد الابدان وان تفرقت كفر، لكنه، كان مع ايمانه باللّٰه وايمانه بامره وخشيته منه جاهلاً بذلک، ضالاً فى هذا الظن مخطئًا، فغفر اللّٰه ذلک. والحديث صريح فى ان الرجل طمع ان لا يعيده اذا فعل ذلک، وادنى هذا يكون شاكاً فى المعاد، وذلک كفر اذا قامت حجة النبوة على منكره حكم بكفره.

...... **فغاية ما فى هذا انه كان رجلاً لم يكن عالماً بجميع ما يستحقه اللّٰه من الصفات، وبتفصيل انه القادر، وكثير من المؤمنين قد يجهل مثل ذلک فلا يكون كافرًا**(۲۸)

''اس شخص کا گمان تھا کہ جب اسے اس طرح بکھیر دیا جائے گا تو خدا تعالیٰ اس پر قدرت نہیں پا سکیں گے اور اس نے سمجھا کہ جب وہ ایسی حالت میں ہوگا تو وہ اسے دوبارہ نہیں اٹھائے گا۔ یہ دونوں باتیں یعنی انکارِ قدرتِ الٰہی اور بکھر جانے کے بعد جسموں کو دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار' کفر ہیں۔ لیکن وہ خدا اور اس کے احکامات پر ایمان اور اس کا خوف رکھتے ہوئے اس سے بے خبر تھا اور اپنے اس گمان میں غلطی کی وجہ سے گمراہی پر تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما دیا۔

مذکورہ حدیث اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ اس شخص کی خواہش تھی کہ جب وہ یہ کام کرے تو اسے دوبارہ نہ اٹھایا جائے' اس کے اس عمل کو کم سے کم بھی قیامِ قیامت کے بارے میں شک پر محمول کیا جائے گا۔ اگر آخرت کے منکر پر حجتِ نبوت قائم ہو چکی ہو تو اس پر کفر کا حکم لگایا جائے گا۔

اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ یہی بات ہے کہ وہ شخص ان تمام صفات سے' جن کا خدا مستحق ہے اور اس تفصیل سے کہ وہ قادر ہے' لاعلم تھا۔ بہت سے ایمان والے اس طرح کی باتوں سے بے خبر ہوتے ہیں' لہٰذا ایسا شخص کافر نہ ہوگا''۔

● *مذکورہ حدیث کا مفہوم بیان کرتے ہوئے امام ابن الوزیرؒ رقم طراز ہیں کہ:*

انما ادركته الرحمة لجهله وايمانه باللّٰه والمعاد، ولذلک خاف العقاب. واما جهله بقدرة اللّٰه تعالىٰ على ما ظنه محالا فلا يكون كفرًا، الا لو علم ان الانبياء جاؤوا بذلک وانه ممكن مقدور، ثم كذبهم او احدا منهم، لقوله تعالىٰ: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ (الاسراء)(۲۹)

''وہ رحمت ایزدی کا مستحق اس لیے ٹھہرا کہ جاہل تھا نیز خدا تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا تھا۔ اسی لیے تو وہ سزا سے خائف تھا۔ جہاں تک قدرتِ خداوندی کے بارے میں اس کی جہالت کا تعلق ہے' جو اس کے گمان کے مطابق خدا کے لیے محال تھا تو یہ کفر نہیں (البتہ اس صورت میں کفر ہوتا) اگر وہ اس بات سے باخبر ہوتا کہ انبیاء کرام علیہم السلام یہی عقیدہ لے کر آئے تھے اور یہ بھی قدرتِ خداوندی سے باہر نہیں اور پھر وہ تمام انبیاء یا ان میں سے کسی

*

ایک کو جھٹلا دیتا' کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ہمارا یہ طریقہ نہیں کہ رسول بھیجنے سے پہلے ہی عذاب کرنے لگیں''۔

● علامہ ابن القیم الجوزیہ رحمۃ اللہ علیہ کفر کی مختلف حالتوں اور قسموں پر بحث کرتے ہوئے مذکورہ حدیث کا معنی یوں بیان کرتے ہیں:

واما جحد ذلک جهلا او تاويلا يعذر فيه صاحبه فلا يكفر صاحبه به' كحديث الذى جهد قدرة الله عليه وامر اهله ان يحرقوه ويذروه فى الريح' ومع هذا فقد غفر الله له' ورحمه لجهله' اذا كان ذلک الذى فعله مبلغ علمه' ولم يجحد قدرة الله على اعادته عنادًا او تكذيبًا (۳۰)

''رہا ایسے جہل یا تأویل کی بنا پر اس (شریعت) کا انکار (جن کا مرتکب معذور سمجھا جاتا ہے) تو اس وجہ سے وہ شخص کافر نہ ہوگا جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک آدمی نے اپنے اوپر اللہ کی قدرت کا انکار کیا اور اپنے اہل وعیال سے کہا کہ وہ اسے جلا کر ہوا میں بکھیر دیں' لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما دیا اور اس کی جہالت کی وجہ سے اس پر رحم فرمایا۔ کیونکہ اس نے جو کچھ کیا تھا' اپنے علم کے مطابق ہی کیا تھا اور اپنے لوٹائے جانے کے بارے میں خدا کی قدرت کا انکار تکذیب یا عناد وسرکشی پر مبنی نہ تھا''۔

☆ **دوسری دلیل**: وہ اُمور جن کا علم تفصیلی دلائل سے حاصل ہوتا ہے' ان کے جھٹلانے والے کو علی الاطلاق کافر نہ کہنے کی دوسری دلیل سیدنا قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ کا وہ مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے تأویل کی بنا پر شراب کو حلال سمجھ لیا اور جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے کہا: **لو شربت كما يقولون ما كان لكم ان تجلدونى** ''اگر لوگوں کے کہنے کے مطابق میں نے شراب پی ہے تو تمہیں اس پر حد جاری کرنے کا اختیار نہیں''۔ سیدنا عمرؓ نے پوچھا' کیوں؟ قدامہؓ کہنے لگے کہ قرآن میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿**لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا**......﴾ (المائدۃ: ۹۳) 'ایسے لوگوں پر جو کہ ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے پیتے رہے ہوں......'' سیدنا عمرؓ نے فرمایا: **اخطأت التاويل' انک اذا اتقيت الله اجتنبت ما حرم الله عليک** یعنی تو نے تاویل میں غلطی کی' اگر تو خدا سے ڈرتا تو اس شے سے اجتناب کرتا جو خدا نے تجھ پر حرام کی ہے۔ بعد ازاں آپؓ نے ان پر حد لگانے کا حکم دیا۔ (۳۱)

شراب کی حرمت ایک قطعی اور واضح حکم ہے اور سیدنا قدامہؓ خود عرب تھے' لیکن انہیں غالباً یہ شبہ لاحق ہوا کہ حرمت شراب ایک عام حکم ہے' جسے سورۃ المائدۃ کی اس آیت نے خاص کر دیا ہے' لہٰذا انہوں نے اسے حلال سمجھ لیا۔ اس پر صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے بھی ان پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا بلکہ ان پر ان کی غلطی واضح کی۔ جسے انہوں نے تسلیم کر لیا۔ لیکن اگر وہ اسی پر مصر رہتے تو یہ کفر ہوتا۔

● شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سیدنا قدامہؓ اور ان کے بعض ساتھیوں کے شراب کو حلال سمجھنے کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

لما ذکر ذلک لعمر بن الخطاب اتفق ھو وعلی بن ابی طالب وسائر الصحابة علی انھم ان اعترفوا بالتحریم جلدوا' وان اصروا علی استحلالھا قتلوا(۳۲)

''جب یہ معاملہ سیدنا عمر بن خطابؓ کے سامنے ذکر کیا گیا تو انہوں نے سیدنا علیؓ اور تمام صحابہؓ سمیت یہ متفقہ فیصلہ کیا کہ اگر وہ حرمتِ شراب کا اعتراف کرلیں تو انہیں کوڑے لگائے جائیں اور اگر وہ اسے حلال سمجھنے پر مصر رہیں تو انہیں قتل کردیا جائے۔''

☆ تیسری دلیل : ''ذاتِ انواط'' کا واقعہ بھی اس اصول کی ایک اہم دلیل ہے۔ سیدنا ابوواقد اللیثی بیان کرتے ہیں کہ حنین کو جاتے ہوئے نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ ایک درخت کے پاس سے گزرے جسے مشرکوں نے ''ذاتِ انواط'' کا نام دے رکھا تھا۔ وہ اس پر اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے' اس کے پاس جانور ذبح کرتے تھے اور وہاں درگاہ اور میلہ لگاتے تھے' بعض فوجیوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ آپؐ ہمارے لیے بھی ذات انواط بنا دیجیے' جیسے ان کے لیے ذات انواط ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((سُبۡحَانَ اللّٰہِ! ھٰذَا کَمَا قَالَ قَوۡمُ مُوۡسٰی ﴿اِجۡعَلۡ لَّنَا اِلٰھًا کَمَا لَھُمۡ اٰلِھَۃٌ﴾ (الاعراف:۱۳۸) وَالَّذِیۡ نَفۡسِیۡ بِیَدِہٖ لَتَرۡکَبُنَّ سُنَّۃَ مَنۡ کَانَ قَبۡلَکُمۡ))(۳۳)

''سبحان اللہ' تم نے بھی وہی بات کہی جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہی تھی کہ ''ہمارے لیے بھی ایک معبود بنا دیجیے جس طرح ان کے لیے معبود ہیں''۔ بخدا جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' تم بھی اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقے پر چلو گے''۔

اس قصے میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مطالبے پر نبی اکرم ﷺ کے جواب کے دو معنی بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو محض مشرکین کی مشابہت سے روکا تھا اور وہ شرک کے مرتکب نہ ہوئے تھے۔

دوسرا یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے مشابہت کے معنی یہ ہیں کہ صحابہؓ میں بھی شرکیہ اعتقاد پایا گیا تھا۔ اگر پہلا مفہوم مراد لیا جائے تو پھر تو کوئی اشکال ہی نہیں رہا' لیکن اگر دوسرے معنی کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اس بات سے روکا تو ضرور ہے لیکن انہیں کافر یا مشرک قرار نہیں دیا' کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قصد یہ نہ تھا کہ ہم شرک کا ارتکاب کرنا چاہتے ہیں۔

مندرجہ بالا بحث کا حاصل یہ ہے کہ جب کسی کفریہ فعل یا قول کے مرتکب کا ارادہ و نیت محتمل ہو تو احتمال ختم کیے بغیر اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

*

1

نقل کفر کا مسئلہ

مسئلہ زیر بحث سے متعلق ایک اہم قضیہ یہ بھی ہے کہ متفقہ طور پر کفریہ قول نقل کرنے کا کیا حکم ہے! اہل علم کے نزدیک یہ کفر نہیں۔ یہ جملہ تو زبان زد عام ہے کہ ''نقل کفر، کفر نباشد'' یعنی کفر کو نقل کرنا کفر نہیں''۔

- امام نووی لکھتے ہیں:

لا يصير المسلم كافرًا بحكايته الكفر(٣٤)

''مسلمان، کفر کی حکایت کی بنا پر کافر نہ ہوگا۔''

- ابن المفلح فرماتے ہیں:

ولا يكفر من حكى كفرا سمعه ولا يعتقده، ولعل هذا اجماع(٣٥)

''جو کسی کفریہ بات کو سن کر نقل کر دے اور اس کا اعتقاد نہ رکھتا ہو تو اسے کافر نہیں کہا جائے گا۔ یہ تقریباً اجماعی مسئلہ ہے''۔

- امام غزالی وغیرہ نے اس کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ یہ صرف حاکم کی مجلس میں ہوسکتا ہے۔ لیکن علامہ ابن حجر الہیثمی کہتے ہیں:

وفيه نظر بل ينبغي انه حيث كان في حكايته مصلحة جازت(٣٦)

''یہ کہنا محل نظر ہے، بلکہ اس سلسلے میں یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ اس میں کوئی مصلحت ہو تو ایسی صورت میں یہ جائز ہے۔''

یعنی جہاں بھی مصلحت کا تقاضا ہو کفریہ اقوال نقل کیے جا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم فقہ اور عقائد کی کتابوں میں ''**كتاب الردة**'' کے تحت کفریہ اقوال بیان کرتے ہیں اور صدر اوّل سے آج تک علماء کا یہی طریقہ ہے۔ گویا اس پر اجماع ہے۔ اگر یہ کفر ہوتا تو علماء ایسا کیوں کرتے۔ لیکن یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ کفریہ قول تو قولی طور پر ہی بیان ہوگا، لیکن اگر کوئی کسی کفریہ فعل کو باقاعدہ عملاً کر کے بھی دکھائے تو یہ درست نہیں، مثلاً کوئی شخص یہ بیان کرے کہ کسی نے قرآن کریم کو اٹھا کر زمین پر دے مارا اور عملاً ایسا کرے بھی، تو یہ حرام ہے، کیونکہ اصل مقصود خبر ہے جو صرف کلام سے ہی حاصل ہو جاتا ہے، عملاً اس کا مظاہرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم!

(۳) شخص معین سے کفر کا ثبوت حتمی و یقینی ہو

علماء نے اس امر کو لازم قرار دیا ہے کہ متعین فرد پر کفر کا حکم لگانے سے قبل اچھی طرح یہ تحقیق کر لی جائے کہ واقعتاً اس سے کفریہ قول یا فعل سرزد بھی ہوا ہے یا نہیں۔ بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی نسبت سے کوئی ایسی بات مشہور ہو جاتی ہے یا کر دی جاتی ہے جو کفر و شرک کو متضمن ہوتی ہے،

لیکن درحقیقت وہ شخص اس سے بری ہوتا ہے۔ایسی صورت میں اگراس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جائے تو یہ اس پر بہتان طرازی کے مترادف ہوگا اور کفر کا فتویٰ لگانے والے پر ہی لوٹ آئے گا۔جیسا کہ حدیث نبویؐ میں تصریح موجود ہے۔قرآن کریم میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ خبر کی تحقیق کرلیا کریں۔ارشادربانی ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَ كُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ۝۶﴾ (الحجرات)

''اے مسلمانو!اگر کوئی فاسق تمہیں خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو'ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچادو پھر اپنے کیے پر پشیمانی اٹھاؤ۔''

اسی طرح یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ محض ظن وتخمین کی پیروی نہیں کرنی چاہیے اور جس چیز کا علم نہ ہو اس کے درپے نہ ہونا چاہیے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۝۳۶﴾ (الاسراء)

''جس بات کی تجھے خبر نہ ہو'اس کے پیچھے مت پڑ' کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہرایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے۔''

● فضیلۃ الشیخ محمد صالح العثیمین شرائط تکفیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

الثانی: ثبوت قیامه بالمکلف(۳۷)

''تکفیر کی دوسری شرط یہ ہے کہ مکلّف سے کفریہ قول یا فعل کی نسبت ثابت ہو''۔

☆ ثبوت کا طریق کار

رہا یہ سوال کہ کسی شخص سے متعلق کفریہ امور کی نسبت کا اثبات کیسے ہوگا تو اس کے بارے میں الشیخ عبدالرحمٰن بن فؤاد لکھتے ہیں:

لیشترط فی اثبات فعل المکلف ان یثبت بطریق شرعی صحیح' لا بظن او بتخریص او بالشک' وذلک بان یکون الاثبات اما بالاقرار او البینة(۳۸)

''مکلّف کے فعل کے اثبات کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ صحیح شرعی طریقے سے ثابت ہو'نہ کہ محض گمان'اندازے یا شک سے'اور اثبات کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ اقرار یا صریح دلیل کے ذریعہ ہو''۔

یعنی کوئی شخص ازخود یہ اقبال کرے کہ وہ کسی ایسے قول یا فعل کا مرتکب ہوا ہے جو کفر پر مبنی ہے ورنہ واضح دلیل (بیّنہ) ہو اور اس سے مراد عادل گواہ ہیں' جن کی تعداد کم ازکم دو ہونی چاہیے۔(۳۹)

موجودہ زمانے میں اس اہم شرعی قاعدے کو بالکل نظرانداز کردیا گیا ہے' بلکہ اس سے مجرمانہ

*

غفلت کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ لوگ اپنے مخالفین کی طرف ایسی بے سروپا باتیں منسوب کر دیتے ہیں، جن کا عوام میں پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور عوام کالانعام بلا سوچے سمجھے کفر وفسق کے فتوے چسپاں کر دیتے ہیں لیکن جب اصل متہم فریق سے حقیقت حال دریافت کی جاتی ہے تو اس کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی۔ یہ رویہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ اور قابل مذمت ہے جس کی اصلاح کی جانی چاہیے۔

(۴) فردِ معین پر اقامت حجت ہو چکی ہو☆

فردِ معین کی تکفیر کے لیے ایک انتہائی اہم اور لازمی شرط یہ ہے کہ اس پر حجت پوری ہو چکی ہو، یعنی اس کی غلطی شرعی نصوص کی روشنی میں واضح کی جا چکی ہو۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

حکم الوعید علی الکفر لا تثبت فی حق الشخص المعین حتی تقوم علیه الحجة(٤٠)

''کفر پر وعید کا حکم کسی معین شخص کے حق میں ثابت نہ ہو گا تا آنکہ اس پر حجت قائم ہو جائے''۔

ایک اور مقام پر رقم طراز ہیں:

''**ولیس لاحد ان یکفر احدا من المسلمین وان اخطا وغلط حتی تقام علیه الحجة وتبین له الحجة. ومن ثبت اسلامه بیقین لم یزل عنه ذلک بالشک بل لا یزول الا بعد اقامة الحجة وازالة الشبهة**(٤١)

''کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی مسلمان کی تکفیر کرے خواہ وہ خطا اور غلطی پر ہی کیوں نہ ہو تا آنکہ اس پر حجت پوری کر دی جائے اور اس کے سامنے سیدھا راستہ واضح کر دیا جائے۔ جس شخص کا اسلام یقینی طور پر ثابت ہو وہ اس سے شک کی بنا پر زائل نہ ہو گا بلکہ اقامتِ حجت اور ازالہ شبہہ کے بعد ہی زائل ہو گا''

اہل السنۃ والجماعۃ نے اقامت حجت کی شرط کے لیے قرآن کریم کی کئی آیات سے استدلال کیا ہے، مثلاً:

(۱) خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾۱۵ (الاسراء)

''اور ہم ہرگز عذاب دینے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ ہم (اس قوم میں) کسی رسول کو بھیج دیں۔''

☆ اقامتِ حجت کی شرط ان اقوال وافعال کے لیے نہیں جو فی نفسہٖ کفر ہیں، مثلاً خدا اور رسول کو گالی دینا یا قرآن کریم کو جان بوجھ کر نجاست میں پھینکنا وغیرہ۔ اس کا بیان اوپر گزر چکا ہے۔

● علامہ شوکانیؒ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"...... **فبین سبحانہ انہ لم یترکھم سدیٰ' ولا یواخذھم قبل اقامۃ الحجۃ علیھم والظاھر انہ لا یعذبھم لا فی الدنیا ولا فی الآخرۃ الا بعد الاعذار الیھم بارسال الرسل**(۴۲)

"اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ اس نے لوگوں کو بے کار نہیں چھوڑ دیا اور وہ ان پر حجت تمام ہونے سے قبل ان کا مواخذہ نہیں فرمائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں انہیں عذاب نہ دے گا تا آنکہ رسول بھیج کر ان کا عذر ختم کر دے"۔

● امام بغویؒ اس کی تفسیر میں رقم طراز ہیں کہ:

اقامۃ للحجۃ وقطعاً للعذر' وفیہ دلیل علی ان ما وجب وجب بالسمع لا بالعقل

"(یہ اس لیے ہے تاکہ) حجت قائم ہو جائے اور عذر باقی نہ رہے۔ اس میں اس امر کی دلیل بھی ہے کہ انسان پر جو کچھ واجب ہوتا ہے اس کا ذریعہ محض شریعت ہے' عقل نہیں"۔

(۲) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿**كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ⑧ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ⑨**﴾ (الملک)

"جب کبھی اس (جہنم) میں کوئی گروہ ڈالا جائے گا اس سے جہنم کے داروغے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس ڈرانے والا کوئی نہیں آیا تھا؟ وہ جواب دیں گے کہ بے شک آیا تھا لیکن ہم نے اسے جھٹلایا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ بھی نازل نہیں فرمایا۔ تم بہت بڑی گمراہی میں ہی ہو۔"

آیت کا یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اگر کسی کے پاس ڈرانے والا نہیں پہنچا تو اس کو عذاب بھی نہیں ہوگا۔

(۳) ارشاد ربانی ہے:

﴿**وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ⑬⑭**﴾ (طٰہٰ)

"اور اگر ہم ان لوگوں کو اس سے پہلے (ہی) کسی عذاب کے ذریعہ ہلاک کر ڈالتے تو یہ کہتے: اے ہمارے ربّ! تو نے ہمارے پاس کسی رسول کو کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیتوں کی پیروی کر لیتے' اس سے قبل کہ ہم ذلیل اور رسوا ہوتے"۔

(۴) قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿**ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ⑬①**﴾ (الانعام)

"یہ (رسولوں کا بھیجنا) اس لیے تھا کہ آپ کا ربّ بستیوں کو ظلم کے باعث ایسی حالت میں تباہ کرنے والا نہیں ہے کہ وہاں کے رہنے والے (حق کی تعلیمات سے بالکل) بے خبر ہوں۔ (یعنی انہیں کسی نے حق سے آگاہ ہی نہ کیا ہو)" (ترجمہ از عرفان القرآن)

*

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص غافل ہو اور اس کے پاس کوئی متنبہ کرنے والا نہ پہنچا ہو اسے عذاب نہیں دیا جائے گا' نیز یہ ظلم ہے جس سے باری تعالیٰ پاک ہے۔(٤٣)

(۵) اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴾ (النساء)

''اور جو شخص رسول (ﷺ) کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس پر ہدایت کی راہ واضح ہو چکی اور مسلمانوں کی راہ سے جدا راہ کی پیروی کرے تو ہم اسے اسی (گمراہی) کی طرف پھیرے رکھیں گے جدھر وہ (خود) پھر گیا ہے اور (بالآخر) اسے دوزخ میں ڈالیں گے' اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔'' (ترجمہ از عرفان القرآن)

(۶) سید الفقہاء والمحدثین امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی الجامع الصحیح میں ایک باب بایں الفاظ قائم کرتے ہیں:

باب: قتل الخوارج والملحدين بعد اقامة الحجة عليهم وقول الله : ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ﴾(التوبة:١١٥)

''خوارج اور ملحدین کو حجت قائم ہونے کے بعد قتل کرنے کا بیان اور خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''اللہ کی شان نہیں کہ وہ کسی قوم کو گمراہ کر دے اس کے بعد اس نے انہیں ہدایت سے نواز دیا ہو' یہاں تک کہ وہ ان کے لیے وہ چیزیں واضح فرما دے جن سے انہیں پرہیز کرنا چاہیے۔''(٤٤)

● امام ابن کثیرؒ اس آیت مبارکہ کے تحت رقم طراز ہیں کہ:

يقولُ تَعالٰى مخبرًا عن نفسه الكريمة وحكمه العادل : انه لا يضل قوما الا بعد بلاغ الرسالة اليهم' حتى يكونوا قد قامت عليهم الحجة' كما قال تعالىٰ: ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾(فصلت/حم السجدة:١٧) (٤٥)

''اللہ تعالیٰ خبر دے رہا ہے کہ وہ کریم و عادل خدا کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد حجت پوری کیے بغیر گمراہ نہیں کرتا' جیسا کہ اور مقام پر فرمایا: اور جو قوم ثمود تھی' سو ہم نے انہیں راہِ ہدایت دکھائی تو انہوں نے ہدایت کے مقابلے میں اندھا رہنا ہی پسند کیا......''

● صحیح بخاری کے مذکورہ ترجمۃ الباب کی شرح میں علامہ بدرالدین عینیؒ لکھتے ہیں کہ:

اشار بهذه الاية الكريمة الى ان قتال الخوارج والملحدين لا يجب الا بعد اقامة الحجة عليهم واظهار بطلان دلائلهم' والدليل عليه هذه الاية ' لانها تدل على ان الله لا يواخذ عباده حتى يبين لهم ما ياتون وما يذرون(٤٦)

''امام بخاریؒ نے اس آیت کریمہ سے اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے کہ خارجیوں اور ملحدوں سے لڑائی' ان پر حجت قائم کرنے اور ان کے دلائل کا بطلان ظاہر ہونے کے بعد ہی

واجب ہوگی۔ اس پر دلیل یہ مذکورہ آیت ہے' کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی گرفت اس وقت تک نہ فرمائے گا جب تک یہ واضح نہ فرما دے کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیا چیز چھوڑنی ہے۔''

قیامِ حجت سے مراد

اس سے مراد یہ ہے کہ جس شخص سے کوئی کفریہ قول یا عمل سرزد ہوا ہے' اس کے سامنے شریعت کی رہنمائی واضح کردی جائے یہاں تک کہ اسے معلوم ہو جائے کہ اس کا قول وفعل قرآن و سنت کے احکام کے منافی ہے اور وہ اپنے پاس کوئی ایسی دلیل نہ رکھتا ہو' جسے وہ ان شرعی دلائل کے مقابلے میں پیش کر سکے۔

● امام ابن حزمؒ لکھتے ہیں کہ:

وصفة قیام الحجة علیه : ان تبلغه' فلا یکون عنده شیء یقاومها(٤٧)

''قیام حجت کی صورت یہ ہے کہ دلیل اس تک پہنچ جائے اور اس کے پاس کوئی ایسی شے نہ ہو جس کے ذریعے وہ اس کے خلاف مزاحمت کر سکے''۔

یہاں یہ واضح رہے کہ مجرد کسی دلیل کا کسی کے علم میں آ جانا' اس پر قیامِ حجت کے لیے کافی نہیں' بلکہ وہ اسے سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ سمجھنے سے مراد یہ ہے کہ وہ دلیل ایسی زبان میں ہو جسے وہ جانتا ہو اور پھر اتنی وضاحت سے اس کے سامنے آ جائے کہ معروف طریقے کے مطابق ایک صاحب عقل کے سمجھنے کے لیے کافی ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ خود اعتراف ہی کرے کہ میں سمجھ چکا ہوں۔ بہرحال فہم کی کوتاہی بھی قیامِ حجت میں حائل ہو سکتی ہے۔

● شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ:

وھکذا الاقوال التی یکفر قائلھا' قد یکون الرجل لم تبلغه النصوص الموجبة لمعرفة الحق' وقد تکون عنده ولم تثبت عنده' اولم یتمکن من فھمھا' وقد یکون قد عرضت له شبھات' یعذره اللّٰه بھا(٤٨)

''اسی طرح ان اقوال کا معاملہ ہے جن کی بنا پر قائل کی تکفیر کی جاتی ہے کہ کبھی تو اس شخص تک وہ نصوص ہی نہیں پہنچی ہوتیں جن سے حق کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے' کبھی اس کے پاس وہ نصوص موجود تو ہوتی ہیں لیکن اس کے نزدیک وہ ثابت نہیں ہوتیں' یا وہ انہیں سمجھنے پر قادر نہیں ہوتا اور کبھی اسے ایسے شبہات لاحق ہوتے ہیں' جن کی بنا پر وہ خدا کے ہاں معذور متصور ہوگا۔''

☆ قیامِ حجت میں لوگوں کے حالات اور اختلافِ زمان ومکان کی رعایت

قیامِ حجت کے سلسلہ میں زمان ومکان اور مختلف لوگوں کے حالات کا تنوع اور اختلاف بھی

*

اہمیت رکھتا ہے۔ علامہ ابن القیم الجوزیہؒ لکھتے ہیں:

ان قیام الحجة یختلف باختلاف الا زمنة والا مكنة والاشخاص فقد تقوم حجة اللّٰه علی الكفار فی زمانٍ دون زمانٍ‘ وفی بقعة وناحیة دون اخری‘ كما انها تقوم علی شخص دون آخر‘ اما لعدم عقله وتمییزه كالصغیر والمجنون‘ واما لعدم فهمه كالذی لا یفهم الخطاب ویحضر ترجمان یترجم له(٤٩)

’’حجت کا قیام مختلف زمان ومکان اور اشخاص کے اختلاف کی بناء پر مختلف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کافروں پر خدا کی حجت بعض اوقات قائم ہوتی ہے اور بعض زمانوں میں نہیں‘ بعض جگہ پوری ہوتی ہے اور بعض جگہ پوری نہیں ہوتی۔ اسی طرح کچھ لوگوں پر حجت قائم ہو جاتی ہے اور بعض لوگوں پر قائم نہیں ہو پاتی۔ اس کی وجہ یا تو اس شخص کی عقل وتمیز میں کمی ہوتی ہے جیسے چھوٹا بچہ اور پاگل شخص یا پھر اس کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے‘ مثلاً وہ شخص جو کسی زبان کو نہیں سمجھ پا رہا اور نہ ہی کوئی ترجمان موجود ہے جو اسے ترجمہ کر کے بتائے۔‘‘

● شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

وكثیر من الناس قد ینشأ فی الامكنة والازمنة التی یندرس فیها كثیر من علوم النبوات حتی لا یبقی من یبلغ ما بعث اللّٰه به رسوله من الكتاب والحكمة فلا یعلم كثیرا مما یبعث اللّٰه به رسوله‘ ولا یكون هناک من یبلغه ذلک ومثل هذا لا یكفر‘ ولهذا اتفق الائمة علی ان من نشأ ببادیة بعیدة عن اهل العلم والایمان‘ وكان حدیث العهد بالاسلام فانكر شیئا من هذه الاحكام الظاهرة المتواترة فانه لا یحكم بكفره حتی یعرف ما جاء به الرسول(٥٠)

’’بہت سے لوگ ایسے مقامات اور احوال میں پروان چڑھتے ہیں جب بہت سے علومِ نبوت مٹ چکے ہوتے ہیں اور وہاں کوئی ایسا شخص نہیں ہوتا جو اس کتاب وحکمت کی تبلیغ کرے جن کے ساتھ اللہ نے اپنے رسول کو مبعوث کیا تھا۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس تعلیم سے بے خبر ہوتے ہیں جو رسول اللہ کی طرف سے لے کر مبعوث ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں کوئی یہ پیغام پہنچانے والا ہوتا ہے تو اس طرح کے لوگوں کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ اسی لیے ائمہ کرام اس امر پر متفق ہیں کہ جو شخص اہل علم وایمان سے دور کسی جنگل میں پلا بڑھا ہو اور نیا نیا مسلمان ہوا ہو وہ اگر احکام ظاہرہ متواترہ☆ کا انکار کرے تو اس کے کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا تا آنکہ وہ اس (شریعت) سے باخبر ہو جائے جسے رسول اکرم ﷺ لے کر آئے تھے۔‘‘

● کسی شخص کی تکفیر میں زمان ومکان کے اختلاف کے مؤثر ہونے کے بارے میں امام نوویؒ نے بھی علامہ خطابیؒ کی مفصل رائے نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

☆ ان کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔

''ابتدائے اسلام میں اگر کوئی کسی ایسے حکم شرعی کا انکار کرتا جو بنیادی نوعیت کا ہے' لیکن ابھی وہ بہت زیادہ معروف نہیں تو اس کی تکفیر اقامتِ حجت سے پہلے نہیں کی جاتی تھی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی موجودہ زمانے میں اس کا انکار کرتا ہے تو اسے کافر قرار دیا جائے گا' کیونکہ اب یہ احکامات مشہور و معروف ہو چکے ہیں اور ہر مسلمان عامی یا عالم انہیں جانتا ہے' لہٰذا اب اقامتِ حجت کی ضرورت نہیں۔ تمام اجماعی اور متفقہ شرعی احکام کا یہی معاملہ ہے' مثلاً نماز' روزہ' حج کی فرضیت اور زنا' شراب اور سود کی حرمت وغیرہ۔ اس ضابطے سے وہی لوگ مستثنیٰ ہوں گے جو نئے نئے اسلام لائے ہوں کہ یہ لوگ اگر جہالت و لاعلمی کی بنا پر ان کا انکار کریں تو کافر نہ ہوں گے۔ رہے وہ مسائل جن پر اجماع تو ہے' لیکن وہ زیادہ معروف و مشہور نہیں تو ان کے منکر کو کافر نہیں کہیں گے' مثلاً پھوپھی' بھتیجی یا خالہ' بھانجی کو ایک نکاح میں جمع کرنا یا دادی کے لیے وراثت میں چھٹا حصہ ہونا وغیرہ' کیونکہ یہ مسائل عوام میں بہت زیادہ شہرت نہیں رکھتے۔''(۵۱)

☆ احکام و مسائل اور مکلفین کی مختلف اقسام

مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ احکامِ شریعت دو قسموں میں منقسم ہیں:

(۱) احکام متواترہ ظاہرہ: جیسے نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ اور ختم نبوت وغیرہ۔ ان کو ضروریات دین بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے حوالے سے مسلمانوں میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں:

(ا) جو نئے نئے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے یا دور دراز کے ایسے علاقوں میں قیام پذیر ہیں جہاں اہل علم موجود نہیں یا وہاں کفر و الحاد اور دین سے انحراف بہت زیادہ ہے اور حصولِ علم کے مواقع انتہائی قلیل و نادر ہیں۔ چنانچہ یہ افراد اگر ان احکامِ متواترہ ظاہرہ کا انکار کرتے ہیں تو ان پر حکم کفر عائد نہیں کیا جائے گا بلکہ معاملے کی توضیح و تبیین کی جائے گی تاکہ حجت پوری ہو جائے' اس کے بعد بھی اگر یہ اس پر مصر رہیں تو کافر ہوں گے۔

(ب) دوسرے وہ لوگ ہیں جو پرانے مسلمان ہیں اور ایسے علاقوں کے باسی ہیں جہاں بکثرت علمائے شریعت موجود ہیں اور وہاں کے غالب افراد ان احکاماتِ متواترہ ظاہرہ کے ماننے والے ہیں تو ایسی صورت میں اگر کوئی ان کا منکر ہوتا ہے تو یہ کافر ہو جائے گا' کیونکہ اس پر حجت قائم ہو چکی ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

لا خلاف فی کفر المخالف (ای للضروریات) من اهل القبلة المواظب طول عمره علی الطاعات(۵۲)

''اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اہل قبلہ میں سے جو شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا منکر ہو وہ کافر ہے' اگرچہ تمام عمر طاعات و عبادات میں گزار دے''۔

*

(۲) احکام متواترہ غیر ظاہرہ: یہ وہ احکام ہیں جن سے خواص ہی اچھی طرح باخبر ہوتے ہیں (مثلاً دادی کا وراثت میں چھٹا حصہ وغیرہ)۔ ان کے بارے میں مسلمان دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں:

ا) ایک تو عوام ہیں' یہ لوگ ان مسائل کے انکار سے کافر نہ ہوں گے تا آنکہ ان پر حجت پوری ہو جائے۔

ب) خواص یعنی علماء' یہ اگر ایسے مسائل کے منکر ہوں تو کافر ہوں گے۔☆ (۵۳)

☆ حجت کیسے قائم ہوگی؟

عامی پر قیامِ حجت کا طریق یہ ہے کہ وہ علماء سے سوال کرے گا کہ یہ اس کا فرض ہے' کیونکہ وہ ازخود نصوصِ شریعت سے احکام اخذ نہیں کر سکتا۔ جبکہ علماء پر حجت' شریعت کے معتبر دلائل یعنی قرآن' سنت' اجماع اور قیاس صحیح کے ذریعے پوری ہوگی۔ (۵۴)

● یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ جن مسائل میں اہل علم کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ فکر و نظر اور اجتہاد سے متعلق ہیں' ان کی بنا پر کسی کی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔ جیسا کہ مختلف فقہی مذاہب میں بے شمار مسائل اختلافی ہیں' لیکن کوئی عالم بھی دوسرے مسلک کے لوگوں کو کافر نہیں کہتا۔

(۵) مرتکبِ کفر عاقل و بالغ ہو

کسی متعین فرد سے کفریہ قول و فعل کا صدور اسی صورت میں اسے کافر قرار دینے کا موجب بنے گا' جب وہ سن بلوغ کو پہنچ چکا ہو اور صاحبِ عقل و خرد ہو۔ مکلّف یعنی شرعی احکامات کے مخاطب وہی افراد ہوتے ہیں جو عاقل و بالغ ہوں۔ بچے اور پاگل شرعی ذمہ داریوں کے پابند نہیں۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جسے سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةَ عَنِ النَّائِمِ حَتّٰى يَسْتَيْقِظُ' وَعَنِ الصَّبِيِ حَتّٰى يَحْتَلِمَ' وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰى يَعْقِلَ)) (۵۵)

''تین طرح کے افراد سے قلم اٹھا لیا گیا ہے (۱) سوئے ہوئے سے یہاں تک کہ وہ بیدار ہو جائے (۲) بچے سے تا آنکہ وہ بالغ ہو جائے (۳) اور پاگل سے حتیٰ کہ وہ صاحب عقل ہو جائے''۔

☆ اس سلسلے میں ایک اہم وضاحت یہ ہے کہ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جنہیں اہل علم کا ایک گروہ تو متواتر مانتا ہے لیکن دوسرا نہیں۔ تو متواتر ماننے والے کا انکار کفر ہوگا' دوسرے کا نہیں۔ بلکہ بعض علماء کے نزدیک تو جو مسائل ضروریات دین میں سے ہیں ان کا انکار سرے سے کفر ہی نہیں۔ ملاحظہ ہو فتح المبین لشرح الاربعین' ابن حجر الهيثمی رحمہ اللہ ص ۶۹۔

● امام ابن المنذرؒ لکھتے ہیں:

اجمعوا علی ان المجنون اذا ارتد فی حال جنونه انه مسلم علی ما کان قبل ذلک(٥٦)

''علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ مجنون جب حالت جنون میں مرتد ہو جائے تو اسے پہلی حالت کے مطابق مسلمان ہی سمجھا جائے گا۔''

● امام ابن قدامہؒ رقمطراز ہیں کہ:

ان الردة لا تصح الا من عاقل فاما من لا عقل له کالطفل الذی لا عقل له والمجنون، ومن زال عقله باغماء او نوم او مرض، او شرب دواء یباح شربه، فلا تصح ردته ولا حکم بکلامه بغیر خلاف (٥٧)

''ارتداد اسی کا صحیح سمجھا جائے گا جو عاقل ہو، وہ شخص جو عقل نہ رکھتا ہو جیسے بے سمجھ بچہ یا پاگل شخص یا ایسا آدمی جس کی عقل غشی، نیند، کسی بیماری یا کسی ایسی دوا پینے کی وجہ سے زائل ہو جائے جس کا پینا مباح ہے تو اس کا ارتداد معتبر نہ ہوگا اور نہ اس کے کلام پر کوئی حکم لگایا جائے گا۔ اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں۔''

● مسئلہ زیر بحث سے متعلق امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ:

فلا تصح ردة صبی ولا مجنون ومن ارتد ثم جُنّ فلا یقتل فی جنونه

''بچے اور پاگل کا ارتداد کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اگر کسی شخص کو مرتد ہونے کے بعد جنون لاحق ہو گیا تو حالت جنون میں اسے قتل نہیں کیا جائے گا''۔

(٦) ارتکاب کفر آزادی وخود مختاری سے ہو

فردِ معین کا آزاد و خود مختار ہونا بھی ضروری ہے، یعنی جب وہ کفریہ قول وفعل کا ارتکاب کرے تو اپنی مرضی سے کرے اور اس پر کسی قسم کا دباؤ نہ ہو۔ قرآن کریم میں ہے کہ:

﴿وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (النحل)

''مگر جو لوگ کھلے دل سے کفر کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور انہی کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

اس کے برعکس اگر کوئی شخص مجبوری یا زبردستی کی بنا پر کفر کا مرتکب ہو تو یہ تکفیر کے لیے مانع ہوگا جس کی تفصیل ''موانع تکفیر'' کے ذیل میں آئے گی۔ اِن شاءاللہ۔

حواشی

(١) مجموع الفتاویٰ، ابن تیمیة، ج١٢،ص ٤٨٧، ٤٨٨۔

*

(۲) القواعد المثلی فی صفات اللّٰہ و اسمائہ الحسنٰی‘ ابن عثیمینؒ‘ ص ۸۹۔

(۳) مجموع فتاوی شیخ الاسلام‘ ابن تیمیة‘ ج٦‘ص ٦١۔

(٤) منہاج السنة‘ ابن تیمیة‘ ج٥‘ص ٢٤٤۔

(٥) الرد علی البکری‘ ابن تیمیة‘ ص٢٥٧۔

(٦) تہذیب الفروق‘ القرافی‘ج٤‘ص١٥٨۔

(٧) فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة‘ الغزالی‘ ص ١٢٨۔

(٨) العواصم والقواصم‘ ابن الوزیرؒ‘ ج٤‘ ص ١٧٨۔

(٩) التمهید لما فی الموطا من المعانی والاسانید‘ ابن عبدالبر‘ ج١٧‘ص ٢١۔

(١٠) مجموع فتاویٰ و رسائل الشیخ ابن عثیمین‘ ج٢‘ص ١٨٦۔

(١١) صحیح مسلم‘ کتاب الالفاظ وغیرها‘ باب النهی عن سب الدهر۔

(١٢) الصارم المسلول‘ ابن تیمیة‘ ج٣‘ ص ٩٢٢۔

(١٣) ایضاً ج٣‘ ص ١٠٤٣۔

(١٤) ایضاً ج٣‘ ص ١٠٤٣۔

(١٥) الصارم المسلول‘ ج٣‘ ص ٩٥٥۔

(١٦) ایضاً ج٣‘ ص ٩٥٦۔

(١٧) الرحیق المختوم (اردو)‘ علامہ صفی الرحمٰن مبارك پوریؒ ‘ ص٥٤٢۔٥٤١۔

(١٨) الأم‘ الشافعیؒ‘ ج٤‘ ص ٢٦٤۔

(١٩) سنن ابن ماجه‘ کتاب النکاح‘ باب حق الزوج علی المرأة‘ رقم الحدیث ١٨٥٣۔ *علامہ البانی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔*

(٢٠) تفسیر القرآن العظیم‘ ابن کثیرؒ‘ ج١‘ ص ٣٥٩۔

(٢١) نیل الاوطار‘ الشوکانیؒ ‘ ج٦‘ ص ٢٣٤۔

(٢٢) مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام‘ ابن تیمیة‘ ج٤‘ ص ٣٦٠۔

(٢٣) ایضاً‘ ص٢٢۔

(٢٤) رد المحتار‘ ج٥‘ ص ١٧٨۔

(٢٥) *حوالہ کے لیے دیکھئے شاہ اسماعیل شہیدؒ کے رسالہ رد الاشراک کے عربی ترجمہ کا حاشیہ ج١‘ ص ١٠٢۔ یہ ترجمہ علی میاںؒ نے کیا ہے)*

(٢٦) مختصراً فتاوی للجنة الدائمة‘ ج١‘ ص ٣٦٩۔

(٢٧) صحیح البخاریؒ ‘ کتاب بدء الخلق‘ باب حدیث الغار۔

(٢٨) مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام‘ ابن تیمیة‘ ج١١‘ ص ٤١٠۔٤٠٩۔

(٢٩) ایثار الحق علی الخلق‘ ابن الوزیرؒ‘ ص ٤٣٦۔

(٣٠) مدارج السالکین‘ ابن القیم‘ ج١‘ ص ٣٣٩‘٣٣٨۔

(٣١) *یہ قصہ* منصف عبدالرزاق (ج٩‘ ص ٢٤٢۔٢٤٠)۔ سنن بیهقی (ج٨‘ ص ١٦) اور الاصابة (ج٣‘ ص ٢٢٠) *میں موجود ہے۔*

(٣٢) مجموع الفتاویٰ‘ ابن تیمیة‘ ج١١‘ص ٤٠٤۔

(٣٣) سنن الترمذی، کتاب الفتن عن رسول اللهﷺ، باب ما جاء لترکبن سنن من کان قبلکم۔
(٣٤) المجموع، النوویؒ، ج٣، ص ١٠٧۔ **نیز دیکھئے** تحفة المحتاج، ج٩، ص ٨٠۔
(٣٥) الفروع، ابن المفلح، ج٦، ص ١٦٦۔ **نیز ملاحظہ ہو** مطالب اولی النھی، ج٦، ص ٢٨٢۔
(٣٦) التحفة، ج٩، ص ٨٠۔
(٣٧) مجموع فتاوی و رسائل الشیخ ابن عثیمینؒ، ج٢، ص ١٨٧۔
(٣٨) شروط تکفیر المعین، عبدالرحمن الفؤاد، ص٢۔
(٣٩) المغنی مع شرح الکبیر، ج١٠، ص٩٩۔
(٤٠) بغة المرتاد، ص ٣١١۔
(٤١) مجموع الفتاویٰ، ج١٢، ص ٤٦٦۔٤٦٥۔
(٤٢) فتح القدیر، الشوکانی، تفسیر آیت مذکورہ۔
(٤٣) مجموع الفتاویٰ، ج١٩، ص ٢١٥۔
(٤٤) **ملاحظہ ہو** الجامع الصحیح للامام البخاری، کتاب استتابة المرتدین۔
(٤٥) تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر، ج٧، ص ٣٠٣۔
(٤٦) عمدة القاری، العینی، ج١٩، ص ٣٦٩۔
(٤٧) الاحکام فی اصول الاحکام، ابن حزم، ج١، ص ٦٨۔
(٤٨) مجموع الفتاویٰ شیخ الاسلام، ابن تیمیة، ج٣، ص ٣٥٤۔
(٤٩) طریق الھجرتین، ابن القیمؒ، ص ٤١٤۔
(٥٠) مجموع الفتاویٰ، ابن تیمیة، ج١١، ص ٤٠٧۔ **نیز دیکھئے** طریق الھجرتین، ص ٦١٢۔
(٥١) المنھاج شرح صحیح مسلم، مسلم بن الحجاج، النوویؒ، ج١، ص ٢٠٥۔
(٥٢) رد المحتار، الشامیؒ، ج١، ص ٣٧٧۔
(٥٣) العواصم من القواصم، ابن الوزیرؒ، ج٤، ص ١٧٤۔
(٥٤) الثوابت والمتغیرات، ص١٩٧۔
(٥٥) سنن ابوداؤد، کتاب الحدود، باب فی المجنون لیسرق او بصیب حداً۔ (**امام البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے**)
(٥٦) کتاب الاجماع، ابن المنذر، مسئله نمبر ٧١٨، ص ٥٥۔
(٥٧) المغنی، ابن قدامةؒ۔

1

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ(58)

عراق (۲)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

بنو عباس کے طویل دورِ حکومت میں عراق کو بہت سے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ اگر عنانِ خلافت کسی طاقتور خلیفہ کے ہاتھ میں ہوتی تو مختلف عناصر کی باہمی چپقلشوں اور قسمت آزما منچلوں کی شورشوں اور بغاوتوں کو بڑی سرعت سے کچل دیا جاتا' ورنہ اس سرزمین میں سخت بدامنی پھیلی رہتی۔ کوفہ اور بصرہ کے باشندے اپنی جبلی خصوصیات کی وجہ سے ناقابلِ اصلاح تھے۔ نئے دارالخلافہ میں ایسے ہی کچھ اور عناصر آ گئے۔ اسی زمانے میں اقتصادی خوشحالی کے دوبارہ بحال ہو جانے سے اس ملک میں ایسے لوگوں کی ایک بڑی کثیر تعداد آباد ہوگئی' جنہیں وقت آنے پر قسمت آزما افراد شورش پر آمادہ کر سکتے تھے۔ مثال کے طور پر یہ کلیہ اُن زنگیوں پر صادق آیا جو مشرقی افریقہ سے درآمد کیے گئے تھے۔ ان کے علاوہ مذہبی تعصب کی جو چنگاریاں راکھ کے نیچے سلگ رہی تھیں' وہ بارہا بھڑک کر جہاں سوز شعلوں کی صورت اختیار کر لیتی تھیں۔ جس غیر معمولی دانش مندی سے کام لے کر برامکہ اور ان کی رہنمائی میں پہلے تین عباسی خلفاء نے عربوں اور ایرانیوں کے درمیان نازک توازن برقرار رکھا تھا وہ برامکہ کے زوال کے بعد مفقود ہوگئی۔ برامکہ کے اخراج کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ عراق میں نسلی اعتبار سے جو توازنِ اقتدار قائم تھا وہ جاتا رہا' جس کا مطلب یہ تھا کہ ملک کے دو بڑے عناصر یعنی عربوں اور ایرانیوں کے درمیان مفاہمت اور یگانگی پیدا کرنے کی حکمتِ عملی کا خاتمہ ہوگیا۔

اس توازن کے خاتمے کے آثار پہلے پہل علویوں کی شورشوں کے ایک سلسلے کی صورت میں ظاہر ہوئے' جن کا آغاز ابن طباطبا کی بغاوت (199ھ/814ء) سے ہوا۔ دارالخلافہ کے لوگ سنّی خلافت کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور اس سلسلے میں انہوں نے اتنے غلو سے کام لیا کہ جب خلیفہ مامون الرشید نے مفاہمت کی حکمت عملی کو پیش نظر رکھتے ہوئے علوی امام علی الرضا کو اپنے داماد کی حیثیت سے اپنا وارث بنانا چاہا اور علویوں کا سبز رنگ اختیار کر لیا تو وہ خود خلیفہ کے مخالف ہو گئے۔ جونہی خلیفہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اس نے اپنی اس کارروائی کو کالعدم قرار دیا اور اس سلسلے میں اسے

طاقت بھی استعمال کرنا پڑی۔ برامکہ کے اخراج سے عراق میں عربوں کے سیاسی اقتدار میں کوئی اضافہ نہ ہوا' بلکہ اس سے ان کی بربادی کا راستہ ہموار ہو گیا' کیونکہ مرکز میں گہرے روابط کی تنظیم و ترتیب میں خلل واقع ہو جانے کے باعث دربارِ خلافت اور اس کے ذریعے وہاں کی سیاسی زندگی میں ایک نیا عنصر بار پا گیا۔ المستعصم نے اپنی ذاتی حفاظت کے لیے ترکوں کا ایک دستہ تیار کیا اور انہی کے زیرِ حفاظت اپنے بسائے ہوئے شہر سامرہ میں زندگی گزاری۔ خلفاء نے جو ترکی فوج اپنے گرد جمع کر لی تھی' اسے امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی اور عرب عساکر جو پہلے سے چلے آ رہے تھے' ان کے مقابلے میں پس منظر میں جا پڑے' کیونکہ ترک طاقت' سرگرمی اور عسکری روح میں اُن سے بڑھ کر تھے۔ اس طرح لوگوں میں اپنی حفاظت خود کرنے کی اہلیت جاتی رہی اور وہ غیر ملکی فوجوں کی مدد سے حکومت کرنے والے ان اشخاص کے رحم و کرم پر رہ گئے جو یا تو خلیفہ کے نامزد کردہ حاکم تھے اور یا اپنے بل بوتے پر انہوں نے ملک پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ ان غیر ملکی فوجوں نے دوسرے صوبوں پر تسلط جمانے کی کوشش کی۔

مصر اور اس کی وجہ سے شام میں ترک خاندانوں کے ہاتھ میں عنانِ حکومت آ چکی تھی' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ علاقائی حکومتوں کا طریقہ چل نکلا' اگرچہ اس سرزمین سے شاید ہی کوئی قابلِ ذکر فوج بھرتی ہو سکتی تھی۔ المتوکل کے عہد میں ترک حفاظتی دستہ برسرِ اقتدار آ گیا اور ایک با امن اور منظّم حکومت کا قیام ناممکن ہو گیا۔ چند مستثنیات مثلاً المعتضد اور المکتفی سے قطع نظر بعض خلفاء معیاری نہ تھے۔ دربارِ خلافت میں امیر الامراء کے منصب کے لیے جو جنگِ اقتدار جاری تھی' اس کا آلِ بویہ کے برسرِ حکومت آ جانے سے (334ھ/945ء) خاتمہ ہو گیا' کیونکہ دونوں عراق یعنی بابل اور میڈیا ان کے زیرِ نگین تھے۔ ان بغاوتوں کے دوران میں جو زوال پذیر آلِ بویہ کے انحطاط اور طاقتور ترک خاندان سلجوق کے اقتدار کے آغاز (447ھ/1055ء) کا باعث ہوئیں' ایک عجیب اشتراک ظہور میں آیا۔ آلِ بویہ کی فوج کے ایک ترک سپہ سالار ارسلان بساسیری نے کچھ عرصے تک فاطمی خلیفہ المستنصر (451ھ/1059ء) کے نام پر عراق میں حکومت کی' لیکن چونکہ عراق اور مصر اور جنوبی شام کے درمیان بہت فاصلہ حائل تھا (شام کے صحرا میں کھانے پینے کی اشیا کے نہ ملنے سے سفر ممکن نہ تھا' لہٰذا شمالی شام کی راہ سے چکر کاٹ کر پہنچنا پڑتا تھا)' اس لیے عراق میں فاطمیوں کی صحیح معنوں میں حکومت قائم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بساسیری کی مداخلت ایک ایسا واقعہ تھا جو بہت جلد گزر گیا۔ سلاجقہ جو ترکوں کے حقوق کے سب سے بڑے حامی کی حیثیت سے میدان میں آئے تھے اور جنہوں نے خلیفہ کو بالکل کٹھ پتلی بنا رکھا تھا' اپنے آپ کو دینِ اسلام کے صحیح عقائد کے محافظ بھی سمجھتے تھے۔ چنانچہ عراق میں جہاں کہیں کسی نے سر اٹھایا انہوں نے انہیں نہایت سختی سے دبا دیا۔ اگرچہ انہوں نے ایرانی تہذیب کی طرف اپنا میلان ظاہر کر دیا (سلاجقۂ اعظم بغداد میں نہیں' بلکہ اصفہان

میں رہتے تھے)، لیکن انہوں نے عراق کے عربی تمدن میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی۔ ناصرالدین کے عہد میں جب عارضی طور پر ایک حد تک خلافت کا اقتدار بحال ہوا، تب بھی سیاسی اور مذہبی صورتِ حال میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔

عراق تاتاری فاتح ہلاکو خان کے لیے لقمۂ تر ثابت ہوا (656ھ/1258ء) اور خلافت کا چراغ گل ہو جانے کے بعد اُس کے دارالخلافہ بغداد کی حیثیت ایک معمولی صوبائی صدر مقام کی ہو کر رہ گئی۔ منظّم آبپاشی کو نظرانداز کرنے کا جو سلسلہ دسویں صدی کے آغاز ہی سے شروع ہو گیا تھا، برابر جاری رہا اور رفتہ رفتہ عراق ایک لق و دق صحرا بنتا گیا۔ جہاں کہیں کہیں کوئی بڑا گاؤں نظر آ جاتا تھا، وہاں صرف کھجور کے درختوں کی کاشت ہی قابلِ ذکر تھی۔ ایران کے طاقتور صفوی بادشاہ شاہ اسماعیل کے عہد میں عراق کی ایران میں شمولیت (915ھ/1509ء) مستقل نہیں تھی۔ جلد ہی یہ ملک سلطنت عثمانیہ کے قبضے میں چلا گیا۔ 1534ء سے 1918ء تک اسی کا صوبہ رہا۔

1920ء۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر عراق کو برطانیہ کی تولیت میں دے دیا گیا۔

1921ء۔ انگریزوں نے شاہ فیصل اوّل کو عراق کا بادشاہ بنا دیا۔

1924ء۔ نیا آئین نافذ ہوا، جس کی رو سے طے پایا کہ بادشاہ کے اختیارات محدود ہوں گے اور وہ پارلیمانی حکومت کے زیرِ ہدایت کارفرما ہوں گے۔ شاہ فیصل اوّل جو سابق شاہ شریف حسین کا فرزند اور شاہ اردن شاہ عبداللہ کا سوتیلا بھائی تھا، 8 ستمبر 1933ء کو فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا غازی تخت نشین ہوا، جس نے 1934ء سے 1939ء تک حکومت کی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے شاہ فیصل ثانی کو بادشاہ بنایا گیا۔ چونکہ اس وقت وہ کم سن تھا، اس لیے اس کا چچا عبداللہ ایجنٹ مقرر رہا۔ امیر فیصل دوم کی تاج پوشی 1953ء میں ادا ہوئی اور امیر عبداللہ کو ولی عہد مقرر کیا گیا۔

1958ء۔ جولائی میں جنرل عبدالکریم قاسم نے امیر فیصل کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور امیر فیصل کو قتل کر کے ملک کی زمامِ حکومت ایک انقلابی کونسل کے سپرد کر دی۔

1963ء۔ جنرل عبدالسلام عارف نے، جو قاسم کا ایک حلیف تھا، فوجی بغاوت کر کے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا اور عبدالکریم قاسم کو پھانسی دے دی۔

1964ء۔ فوج اور کُرد قبائل کی جنگ رک جاتی ہے۔ سیز فائر ہو جاتا ہے، لیکن چند ماہ بعد دوبارہ جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

1966ء۔ عبدالسلام عارف ہیلی کاپٹر کے حادثے میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اُن کی جگہ اُن کے بھائی عبدالرحمٰن عارف عہدہ سنبھالتے ہیں۔

1967ء۔ اسرائیل سے چھ روزہ جنگ میں عربوں کی شکست کے بعد جنرل عبدالرحمٰن عارف نئی وزارت بناتے ہیں، جس کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل طاہر یحییٰ تھے۔

1968ء۔ پرامن فوجی انقلاب کے ذریعے جنرل عارف اور طاہر یحییٰ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جاتا ہے۔ جنرل حسن البکر انقلابی کمانڈ کونسل کی قیادت کرتے ہیں۔

1969ء۔ چالیس عراقیوں کو، جن میں سے بیشتر یہودی تھے، پھانسی دے دی جاتی ہے۔ ان پر اسرائیل، امریکہ اور ایران کے لیے جاسوسی کا الزام تھا۔

1970ء۔ کُرد قبائل کو کسی قدر خود مختاری دینے کے نتیجے میں اُن سے جنگ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ خلیج فارس کے مسئلے پر ایران سے تنازعہ کھڑا ہوتا ہے۔

1971ء۔ عراق فلسطینی مجاہدین کی حمایت میں اردن کی سرحدیں بند کر دیتا ہے۔ عراق میں امریکی سفارت خانے کی املاک پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔

1973ء۔ کرنل ناظم کی قیادت میں فوجی انقلاب لانے کی کوشش کی جاتی ہے، جسے کچل دیا جاتا ہے اور کرنل ناظم اور اُس کے 35 ساتھیوں کو پھانسی دے دی جاتی ہے۔

1974ء۔ کُرد قبائل عراق کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتے ہیں۔

1975ء۔ ایران کُردوں کی حمایت کرتا ہے۔ بالآخر صلح ہو جاتی ہے۔ ایران سے شط العرب کے سلسلے میں معاہدہ ہوتا ہے۔

1977ء۔ صدر حسن البکر اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے کمانڈ کونسل کے ارکان کی تعداد بڑھا کر 5 سے 22 کر دیتے ہیں۔

1979ء۔ عراق جنوبی یمن اور شمالی یمن کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ حسن البکر صدارت سے استعفا دے دیتے ہیں۔ 16/ جولائی کو صدام حسین عہدۂ صدارت سنبھالتے ہیں۔

1980ء۔ عراق، ایران سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دیتا ہے، جس کے تحت شط العرب ایران کو دینا قرار پایا تھا۔ عراق ایران پر حملہ کرتا ہے۔ عراقی فوج صوبہ خوزستان میں دور تک گھستی چلی جاتی ہے۔ عراق کی فضائیہ ایران کے آبادان کے تیل کے کارخانوں پر بمباری کرتی ہے۔ ایران بغداد، موصل اور بصرہ کے کارخانوں پر بمباری کرتا ہے۔ جنگ زوروں پر ہے۔

1981ء۔ برادر اسلامی ممالک کی طرف سے صلح اور امن کی کوششیں ہوتی ہیں، جو صدر صدام حسین کو منظور نہیں۔ خوزستان میں جنگ جاری ہے۔ اسرائیل کے لڑاکا طیارے بغداد کے قریب فرانس کے بنے ہوئے ایٹمی ری ایکٹر کو تباہ کر دیتے ہیں۔

1982ء۔ ایران، عراق کے جارحانہ حملے کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ عراق خرم شہر اور بندرگاہ خالی کر دیتا ہے۔ ایرانی فوج عراقی سرزمین پر لڑتی ہے اور بصرہ کے قریب تک جا پہنچتی ہے۔

1988ء۔ عراق ایران جنگ آٹھ سال تک جاری رہنے کے بعد ختم ہوئی۔ دونوں پڑوسی اسلامی ملکوں کی معیشت تباہ ہوئی۔ اس طویل جنگ میں دس لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔

1990ء۔صدر صدام حسین علاقائی تنازعے کو بنیاد بنا کر 2/اگست کو کویت پر حملہ کرتے ہیں۔

1991ء۔18/جنوری کو اقوام متحدہ کی مشترکہ فوج امریکی جنرل کی قیادت میں ''آپریشن ڈیزرٹ سٹورم'' کے تحت عراق پر حملہ کرتی ہے اور ایک ہفتے کے اندر اندر کویت کو آزاد کرا لیا جاتا ہے۔

خلیجی جنگ میں عبرت ناک شکست اور شیعوں اور کُردوں کی بغاوت کے باوجود صدام حسین کے اقتدار پر فرق نہیں پڑتا۔اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل نے سوائے خوراک اور ادویہ کے تبادلے کے' تیل برآمد کرنے پر پابندی عائد کر دی۔

1997ء۔عراق اور اقوام متحدہ کے درمیان کشیدگی جاری ہے۔عراق میں ایٹمی بلاسٹک اور جراثیمی اسلحے کی مکمل تباہی کا معائنہ کرنے کے لیے اقوام متحدہ معائنہ ٹیمیں بار بار بھیجتی ہے' لیکن عراق تعاون نہیں کرتا۔امریکہ اور برطانیہ سخت رویہ اور زیادہ معاشی پابندیاں عائد کرنے کے حامی ہیں اور اکثر عراق کے فوجی ٹھکانوں پر ہوائی حملے کرتے ہیں۔

2003ء۔مارچ میں امریکہ اور برطانیہ نے اس بنیاد پر عراق پر حملہ کر دیا کہ وہاں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار موجود ہیں اور یہ کہ عراقی حکومت دہشت گردی کی سرپرستی کر رہی ہے۔ ایک ماہ کی لڑائی کے بعد صدام حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور عراق پر اینگلو امریکی قبضہ ہو گیا۔

جولائی میں عراقی حزبِ اختلاف کے مختلف گروہوں کے نمائندوں پر مشتمل گورننگ کونسل قائم کر دی گئی۔تاہم ملک میں امن و امان اور معاشی حالت کی بہتری کی رفتار بہت سست رہی۔ایک اندازے کے مطابق عراق کی تعمیر نو کے لیے آئندہ بیس برس میں ایک سو ارب ڈالر درکار ہوں گے۔

2004ء۔مارچ میں فلوجہ میں مجاہدین نے امریکیوں پر حملہ کر دیا۔یوں عراق میں قابض فوجیوں کے خلاف جدوجہد کا آغاز ہوا جو اب تک جاری ہے' لیکن اب کھلی جنگ نے ''گوریلا جنگ'' کی صورت اختیار کر لی ہے۔جون میں عبوری آئین کی تشکیل کے بعد عبوری حکومت وجود میں آ گئی۔ ایاد علوی وزیراعظم بن گئے۔اس دوران میں ابوغریب جیل اور دوسری جیلوں میں عراقی قیدیوں پر شرمناک تشدد کے واقعات سامنے آئے' جن پر پوری دنیا میں غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔

2005ء۔ملک میں عام انتخابات ہوئے۔

تین سال ہو گئے ہیں' جو حیثیت افغانستان میں حامد کرزئی کو ہے وہی حیثیت عراق کے وزیراعظم نور المالکی کو حاصل ہے' یعنی امریکا کی دریوزہ گری۔